dear sister

Asalam

Aslam Alikum

پیاری بہن

لیلیٰ کی ڈائری

عطاءُالرحمٰن خاں صاحب عطا وجدانی

عبدالحق اکیڈیمی

اشاعت منزل کوچۂ عبدالحق۔ حیدرآباد دکن

تعداد طبع

۱۰۰۰

جون سنہ ۱۹۴۷ء

قیمت

عہ

فہرست مضامین

عرض ناشر

عطاءالرحمٰن خان صاحب عطاؔ وجدانی زبان اردو کے بہترین انشاپرداز ہیں۔ آپ نے زیرنظر کتاب "لیلیٰ کی ڈائری" جس محنت و توجہ سے لکھی ہے اس کا اندازہ خود ناظرین کرام فرما سکیں گے۔

کتاب ہٰذا کا نصب العین جیسا کہ پیش لفظ میں تحریر ہے "ایسے نوجوانان ملک وملت جو جذبات میں ہیجان اور رنگین طبیعت رکھتے ہیں طوائف کے ہتکنڈوں، بازاری عشق اور اس کے ماحول کے خطرناک واقعات سے واقف اور آگاہ ہو جائیں اور کبھی اپنی ہوس کو عشق سمجھنے کی غلطی نہ کریں وغیرہ وغیرہ"۔

متذکرہ صدر نصب العین کی واقفیت موجودہ دور کی نئی نسلوں کے لیے جسقدر اہم اور ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں اسی لیے اکیڈیمی ہٰذا ایسے ضروری تصنیف کی اشاعت کو جو ہمارے نوجوانوں کے لیے مفید اور مشعل راہ ہو ضروری سمجھا۔ چنانچہ اب یہ زیور طبع سے

آراستہ ہوکر ناظرین کے سامنے پیش ہے۔ امید کہ ہمارے نوجوان اسے غور سے دیکھیں گے اور خود اپنے دل و دماغ کو ایسے تباہ کن نقوش سے محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ کرینگے۔ جوانی کی بے قدری اور طاقت کا غیر صحیح مصرف جو دوسروں کے لیے تباہ کن اور خود کے لیے بے وقت موت کا حکم رکھتا ہے اس سے احتراز ضروری ہے۔ زیر نظر کتاب کے مطالعہ کے بعد ہم امید کرتے ہیں کہ ناظرین کے دلوں میں مندرجہ انعکاس واقعات سے عبرت آموزی کی طلب راسخ پیدا ہوجائے۔ آخر میں خدائے برتر سے دعا ہے کہ مصنف کی محنت ٹھکانے لگے اور ناشر کی کاوشیں کام آئیں فقط

سید علی شبر حاتمی

مُقدّمة

قاضی محمد عبد الغفار

جنگ کی وجہ سے ٹیکسوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بعض اشیاء کی قیمتیں گر رہی ہیں۔ بعض کی چڑھ رہی ہیں۔ ہندوستان کا اخبار نویس بیچارہ خواہ مخواہ یونان اور بلغاریہ کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے بےچین رہتا ہے حالانکہ اپنے خالی وقت میں وہ "مقدمات" لکھتا رہے تو کیا برائی ہے۔

غم نہ داری بز بخر!

اخباروں کے اڈیٹر اہلِ قلم بھی سمجھے جاتے ہیں حالانکہ ایسا ہونا ان کیلیے کچھ ضروری نہیں۔ بعض اہلِ قلم اوس بوڑھے سپاہی کی طرح ہوتے ہیں جس کی بندوق پرانی ہو گئی ہو اور بارود سیل گئی ہو۔ ان وظیفہ یاب سپاہیوں کے کارنامے بچوں کو سنائے جاتے ہیں۔ دیکھو جی تمہارے دادا نے بھرت پور کی لڑائی میں ایک شخص کا سر کاٹ لیا تھا اور گوالیار کے قلعے کی دیوار پر شمشیر بکف چڑھ گئے تھے۔ غدر میں ایک تیر ایسا مارا تھا کہ وہ کشمیری بازار سے چلا تو شاہ بولا کے بڑ کو پار کرتا ہوا دلی دروازہ میں پیوست ہو گیا تھا!

صحافت اور قلم کے میدان میں بھی کہیں کہیں ایسے بوڑھے سپاہی نظر آتے ہیں جنہوں نے ۵۷ء میں کوئی تیر مارا تھا!

پردۂ سخن اپنی طرف ہے! معلوم نہیں وہ کیا عالم تھا کہ لیلیٰ پیدا ہوئی اور اوس نے چند خطوط لکھے۔ دنیائے ادب کے جاسوس اون خطوط کو لے اڑے۔ سماج کے ٹھیکہ داروں میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ ارباب تقدس بڑبڑانے لگے۔ رندان بلاکش سر دھونے لگے۔ بازاروں میں تنقید ہونے لگی۔ ذرا یہ بیحیائی تو دیکھو! کسی بیفکرے نے کہا "ہائے جوانی!" کسی نے سینہ پر ہاتھ مارا۔ کسی نے لاحول پڑھ کر اون اوراق کو چولھے میں رکھ دیا بہانت بہانت کی بولیاں بولی گئیں کہیں سے آہ۔ کہیں سے واہ۔ آخر فنا کی قوت نے ان پرچوں کو بھی ٹھنڈا کر دیا "لیلیٰ" بھی گئی اس کے عشاق بھی گئے اوس کے خطوط بھی پنساری کی دوکان پر پہنچ گئے!۔ وقت آگیا تھا کہ لوگ اس "لیلیٰ" کو بالکل بھول جائیں کہ یکایک دنیائے ادب کے ایک جاسوس کہیں سے "لیلیٰ" مرحومہ کا سادا ازنا پچہ سمیٹ لائے!۔ ایک بوڑھے سپاہی" نے تو بازار کی اس عورت کا صرف نقاب ہی اٹھایا تھا مگر اب جو دیکھتا ہوں تو عطاء الرحمن صاحب نے اوس کے سر سے ساری چادر ہی کھینچ لی!۔ لیلیٰ کے خطوط میں چند ہی گوشے تھے جو روشنی میں لائے گئے تھے مگر "لیلیٰ" کی ڈائری" میں از صحن خانہ تالب بام سارا ہی حجاب ختم کر دیا گیا۔ خلوتیں عریاں ہوگئیں۔ جلوتوں کا رنگ ور وغن ونمود اڑا گیا۔ اور یہ ڈائری ایک ایسی دستاویز ہاتھ لگی کہ اب راقم الحروف کا دعوے ڈگری ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا!۔

ان لوگوں نے "لیلیٰ" کو اس کے خطوط میں دیکھا تھا وہ اب اس کو

اس کی ڈائری میں دیکھ لیں "لیلیٰ" مرحومہ کے رسوائی کا وہ آغاز تھا اور یہ انجام ہے! ۔ نہاں خانہ حیات کی تاریک گوشوں میں عطاء الرحمن صاحب کی یہ تلاش اون کو سینکڑوں صفحات کے وسعت میں لے گئی۔ ڈائری کا آخر منظر ایک بیاہ کا سماں ہے جس میں لیلیٰ نے بہت سے خواتین کے شوہروں اور اپنے بہت سے عشاق کی بیویوں کو دیکھا اور بہت سے راز فاش کیے اور "شرافت" کے غرور کی ٹانگیں کھینچیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ

"میں نے کہا بہنو! مجھ میں اور تم میں سے بعض کے شوہروں میں محض اتنا فرق ہے کہ اون کی سیاہ کاریوں اور بدمستیوں کے داغ پوشیدہ ہیں اور میرے ظاہر ورنہ وہ مجھ سے زیادہ ذلیل اور قابل حقارت ہیں" میرے ان جملوں نے آگ لگا دی اور زوردار طریقہ پر پوچھنے لگیں بتلاؤ ہم میں سے کس کس کے شوہروں کو تم نے اپنے جیسے مینی کے یہاں دیکھا ہے۔ اس جملہ پر میرے آگ لگ گئی اور میرا خرمن صبر جل اٹھا۔

میں نے انگلیوں پر وکیل صاحب جاگیردار صاحب نواب صاحب قوم کے لیڈر (رہنما) صاحب۔ اڈیٹر صاحب۔ سوداگر صاحب منیجر صاحب! انسپکٹر صاحب۔ محرر صاحب۔ منشی جی۔ مولوی صاحب۔ شاعر صاحب۔ پہلوان صاحب۔ پیر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب وغیرہ وغیرہ کے پندرہ بیس نام اوپر نیچے اُن کو گن دیے۔

وہ سنتی رہیں اور "ہائے ہائے" کہتی ہیں اور تعجب کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہیں۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ اور میرے جذبہ انتقام

کو بہت کچھ سکون حاصل ہوگیا ۔ میں چپ ہوگئی ۔ خوش ہوگئی ۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف تکنا دیکھنا اور بعض نے خجل ہونا ۔ دانت پینا اور بھویں تاننا شروع کر دیا میں ان کے جذبات کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی ۔ اور خوش ہوتی رہی مگر قلب پر ایک پوشیدہ خوف بھی محسوس کرتی رہی ۔ جو معاشرہ کے کارکنان کی استبدادیت کے خیال کا لرزہ براندام کرنے والا عکس تھا لیکن ظاہر میں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ۔

اتنے میں ایک آزادخیال تعلیم یافتہ خاتون آگے بڑھی اور اس نے مجھ سے ایک بیحد خوبصورت عورت کا تعارف کرایا اور کہا ۔ "لیلیٰ" یہ تمہارے میر صاحب کی دلہن ہیں اور انھوں نے تمہارے بہت سے واقعات مجھے بتلائے ہیں" ۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں نے میر صاحب کی دلہن کو انتہائی استعجاب مگر مسرت بھری نظروں سے دیکھا ۔ میں چاہتی تھی کہ گھنٹوں اس سے باتیں کروں اور میر صاحب کے متعلق سینکڑوں باتیں پوچھوں لیکن موقع و محل اس کی اجازت نہ دیتا تھا ۔ خاموش ہوگئی ۔

الغرض مجھ سے شب کے نو بجے تک اپنے اپنے شوہروں کے شب ناچوں کی داستان کے ٹکڑے پوچھے گئے ۔ بعض کا عندیہ میرے بیان کی صداقت کا امتحان تھا اور بعض کا عندیہ اپنے شوہر کے کرتوتوں کو ذرا تفصیل سے معلوم کرنا یاد رکھنا اور وقت ضرور شوہر کو بتلا کر ثبوت پیش کرنا تھا ۔ اب میرے لیے یہ گھنٹے بیحد دلچسپ ہوگئے شوق و استعجاب کا دریا بہہ رہا تھا اور میں اس کا منبع و مخرج بنی ہوئی تھی ۔ کاش میں

اس گفتگو کو کبھی معاشرہ کے سامنے پیش کر سکتی - اتنے ہی عزیز صاحب نے لڑکا بھیجا اور مجھے دروازے پر بلایا - جیسے ہی میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی فوراً معلوم کر لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے - مجھے خجل اور پریشانی دیکھکر عزیز صاحب نے فرمایا - "لیلیٰ" - جو کچھ تم نے کیا وہ مناسب نہ تھا - تمام آدمی چراغ پا ہیں - مجھ سے جنگ کر رہے ہیں کہ تمہاری بیوی نے یہ آفت برپا کر دی - آگ لگا دی - کتنوں کے گھروں میں لڑائی جھگڑے فتنہ فساد کے بیج بو دئے - ممکن ہے چند عورتوں کو طلاق تک کی نوبت آجائے - مہروں کے دعوے ہونے لگیں - جدائی علیحدگی اور نان نفقہ کے دعوے ہوں - ممکن ہے بعض جہلا کے گھروں میں مار پیٹ تک کی نوبت پہنچ جائے - لیلیٰ - تم نے یہ کیا کیا؟ -

یہ اس ڈائری کے آخری اوراق ہیں - "لیلیٰ" دنیا سے رخصت ہو چکی اور ڈائری کے راقم الحروف اور اس مقدمہ کے راقم الحروف کو بھی کسی دن فنا ہو جانا ہے اس لیے انصاف شرط ہے اور یہ آدھی بات یاد رہے کہ کوئی صاحب دل "لیلیٰ" کی قبر میں یہ کتبہ کندہ کرا دیں -

"وہ قریب کی محفلیں برپا کرتی ہوئی آئی اور قریب کی محفلیں برباد کرتی ہوئی گئی - خدا کی رحمتیں ہو جیو اس مظلوم پر" -

ہمارے ملک کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ بسا اوقات ذوق صحیح کو سازگار ماحول نصیب نہیں ہوتا - عطا صاحب کے انداز تحریر اور زور قلم کا اندازہ مجھے "لیلیٰ کی ڈائری" کا مسودہ دیکھکر ہوا - اور میں نے محسوس کیا کہ ان کو اردو زبان پر نمایاں قدرت حاصل ہے

اور وہ زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں کو اپنی تحریر میں بہ احسن وجوہ نمایاں کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادبیات کی ترقی میں امداد دینے کے لیے ایسے اصحاب کی خدمات ضروری ہیں جو ادبیات کا ذوق صحیح رکھتے ہوں۔ عطاؔ صاحب کی ادبیت نظم و نثر دونوں پر حاوی ہے اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ علاوہ اس کے کہ وہ ادبیات کی تقریباً ہر صنف میں صاحب تصنیف وتالیف ہیں زبان کے قواعد پر بھی بہت وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اپنے ذوق صحیح سے کام لینے کے بہتر مواقع حاصل کریں۔

پیش لفظ

تمدن ہند پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ عورت کی حیثیت عرفی اور معیار حیات پست ہی نہیں بلکہ اُس کا وجود بہت کچھ مُعطّل اور بیکار کر دیا گیا ہے مردوں کی خود پسندی نے عورتوں پر زیادتیاں کر کے ان کی اصلی زندگی اور ان کے جائز حقوق کو ہی بہت کچھ پامال نہیں کیا بلکہ کشمکش حیات میں اُس ضروری اور خلقی اعانت کو بھی جو صنف نازک سے مل سکتی تھی۔ مرد کے دست استبداد۔ غلبہ پسند ذہنیت نے کھو دیا ہے اور یہ اس لیے زیادہ تاسف انگیز ہے کہ اس کو دانشمندی تو کیا سیاسی حکمت عملی بھی نہیں کہہ سکتے صرف جہالت اور حماقت کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ مرد کے موجودہ معاشری رویہ سے ہر دو اصناف کو ایسا نقصان پہنچ رہا ہے جس کا تباہ کن اثر قومی اور

ملکی مفاد بگڑ رہا ہے سفینۂ ملک و ملت ورطۂ ہلاکت میں ہے ہوائے تند و تیز کے تھپیڑے کھا رہا ہے ناؤ ڈگمگا رہی ہے اور ہچکولے کھا رہی ہے

بطور استعارہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی گاڑی دو گھوڑوں سے چلتی اور کھینچی جاتی ہے جس میں دائیں طرف مرد جو اسے سنبھالے ہوئے ہے اور بائیں جانب عورت لگی ہوئی ہے دونوں کی اجتماعی طاقت اور کوشش سے یہ گاڑی بآسانی چلتی ہے اور چلتی رہتی ہے اپنے وقت پر منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے راستے کے خس و خاشاک روڑوں پتھروں گڑھوں اور خندقوں کو بآسانی عبور کر لیتی ہے اور دنیا کی سرد و گرم ہوا کو۔ گھنگھور گھٹاؤں آندھیوں بارشوں طوفانوں اور زلزلوں کو بآسانی برداشت کر لیتی ہے

لیکن حضرت اسپ نے ہنہنانے اور منہ زور ہونے کے باعث اپنی طاقت کے زعم میں مادہ کو اپنی حماقت کی دم اور جہالت کی جھول کے اثر سے جوئے سے نکال کر بند گاڑی میں مقید کر دیا بھاری پردے ڈال دیئے اور محض دانہ گھاس کی حفاظت اور بچوں کی پرورش اس کے ذمہ کر دی لیکن اصل مقصد اس بھگوڑے گھوڑے کا یہ تھا کہ رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر مختلف اصطبلوں کی سیر کرتا پھرے اور اصیل اور غریب مادہ کو اس کا علم نہ ہو سکے۔ اس طرح اس اسپ بے لگام نے زندگی کی گاڑی کو جو اب اور بوجھل ہو گئی ہے اکیلے کھینچنا شروع کر دیا۔ سرپٹ بھاگتا ہے ٹھوکریں کھاتا ہے اور لڑکھڑاتا ہے۔

کہہ دواں سے نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام
گر بھی پڑتے ہیں کبھی دوڑ کے چلنے والے

کبھی چلا ہی نہیں جاتا تو گھٹنے ٹیک دیتا ہے کبھی جھٹکے دیتا ہے تو گاڑی الٹ الٹ جاتی ہے جب راہ میں روڑے اٹکتے ہیں پتھر حائل ہوتے ہیں تو الف ہو جاتا ہے۔ منہ کے بل گرتا ہے اور منہ کی کھاتا ہے اور اب اس منہ زور کا کیا منہ ہے کہ بند گاڑی میں عرصہ دراز سے چھپی ہوئی مادہ کو گاڑی چلانے میں اپنے ساتھ لگا لے کیونکہ اگر اب مادہ باہر آتی ہے اور نر کا ہاتھ بٹاتی ہے کچھ سہارا دیتی ہے اور گاڑی ساتھ چلاتی ہے تو اول تو دوسرے گھوڑے دولتیاں مارتے اور بنظر تمسخر دیکھتے ہیں اور ہنہناتے ہیں دوسرے مادہ اب گاڑی میں پڑی رہنے اور بند رہنے سے آرام پسند اور لاغری ہی نہیں بلکہ نیم مردہ ہو گئی ہے تمازت آفتاب کی بھی تاب نہیں لا سکتی۔

مدت مدید کے بعد یہ نتیجہ ظہور پذیر ہوا کہ دیگر اقوام و دیگر ممالک کی گاڑیاں جس میں نر اور مادہ دونو ساتھ ساتھ زور لگاتے اور کھینچتے ہیں فرّاٹے بھرتی ہوئیں کہیں کی کہیں پہنچ گئیں ہزاروں میل آگے نکل گئیں۔ لیکن ہندوستانی گاڑیاں گڑھوں خندقوں کیچڑ اور دلدل میں پھنس پھنسا کر پیچھے کی پیچھے رہ گئیں اور گاڑیوں کے انجر پنجر ہل گئے۔ اور چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔

انھیں بند گاڑیوں میں گھسیٹی ہوئی بھاری پردوں میں پروردہ۔ ادہ

نیم مردہ۔ ذرا بے لگام اور آزادہ رو مادہ کی (جس کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے زمانے کی ہوا اور عقل کی وسعت ودرازیوں سے ہٹتے گئے) چیخ وپکار اور اُس کے دورِ حیات کے نشیب وفراز۔ اُس کی دشواریوں۔ وقت گزاریوں اور اس کی راہ کی چٹانوں اور تاریک وادیوں کا خاکہ اس کتاب میں کھینچا گیا ہے۔ جو اپنی خوش لگامی سے تمام گھوڑوں پر تازیانے لگاتی ہے کوڑے مارتی ہے تھکے ہوئے، سوتے ہوئے گھوڑوں کو جگاتی ہے، اٹکی ہوئی گاڑیوں کو چلانے کا سبق سکھاتی ہے۔ گاڑی کو ہموار راہ پر اجتماعی طاقت کے ساتھ کھینچنا چاہتی ہے۔ میانہ روی کو اختیار کر کے زندگی کی بھاری گاڑی کو خارزارِ عالم میں سنبھال کر قدم رکھتے ہوئے منزلِ مقصود پر لیجانا چاہتی ہے............ مگر!

کتاب ہذا میں معاشرہ (سماج) کی تخلیق وترکیب اور اس کے اربابِ بست وکشاد یعنی مردوں کے بیجا غلبہ اور ان کی آئین سازی کی غیر منصفانہ ذہنیت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

جمالیات کے تحت عورت کو جس زاویۂ نگاہ سے مرد نے دیکھا اس کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ نفسیات کے تحت جذبات کو جس خودغرضانہ نقطۂ نظر سے مرد نے مشاہدہ کیا اور بیان کیا اس کو بھی ظاہر کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ مرد عورت کے جذبات کا مشاہدہ حقیقی معنی میں نہیں کر سکا اس نے عورت کو اگر دیکھا بھی تو محض مردانہ نظر سے اور وہ بھی محض بازاری عورت کو آوارہ نظر سے! اُس کے جذبات کو کہیں ظاہر بھی کیا تو

اپنے نقاط نظری سے! لیکن اصلی عورت کو حقیقی انسانی نظر سے کبھی نہ دیکھ سکا! حتیٰ کہ شاعری میں بھی مرد نے محض اپنی جذبات نگاری کو روا رکھا اور عورت کے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکا۔ کہیں کہیں شاعری کے پارینہ تخیلات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

عیاشانہ زندگی اور اس کے عبرت آموز واقعات اور علی الخصوص عیاشانہ جذبات کا تجزیہ نفسیات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ بتلایا گیا ہے کہ اکثر نوجوان عیاشوں کو میر صاحب کی طرح اپنی بوالہوسی کی مصنوعی نقاشی میں اصلی عشق کی دلکش تصویر نظر آیا کرتی ہے جس کی خاطر وہ بہت شور مچاتے ہیں گریہ وزاری کرتے ہیں ہیجان انگیز خواب دیکھتے ہیں لیکن ہوس کا بھوت سر سے اتر جانے پر وہ اپنی غلطی اور توازن دماغ کی خرابی کا احساس کرتے ہیں اور پھر گریز یا عہد شکنی کے لیے بہانہ تلاش کرتے ہیں......

مجھے یہ ضرور لکھنا چاہیئے کہ یہ کتاب "لیلیٰ کے خطوط"۔ "مجنوں کے خطوط" اور اور "مجنوں کی ڈائری"۔ کے سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ اور اسی لیئے اس کا نام "لیلیٰ کی ڈائری" رکھا گیا ہے۔ کتاب ہٰذا کا نصب العین مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوجوانان ملک وملت جو جذبات میں ہیجان رکھتے ہیں یا بقول شخصے شاعرانہ اور رنگین طبیعت رکھتے ہیں۔ طوائف کے ہتھکنڈوں، بازاری عشق اور اس کے ماحول کے خطرناک واقعات سے واقف ہو جائیں اور کبھی اپنی ہوس کو عشق سمجھنے کی غلطی نہ کریں عیاشی کے انجام سے قبل از وقت واقف ہو کر اس [illegible] قدم نہ رکھیں ساتھ ہی اس

صنف نازک کو اتنا پست نہ سمجھیں عورت کو سماج میں اس کی اصلی جگہ دیں اور پارینہ تخیلات شاعری کا گم وبیش مقاطعہ کر کے کارآمد تخیلات پر طبع آزمائی کریں اور اپنی اخلاقی قومی اور ملکی زندگی کو بہتر بنانے کی سعی بلیغ کریں۔

علامہ قاضی محمد عبدالغفار صاحب کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود کتاب ہذا پر حوصلہ افزا مقدمہ تحریر فرمایا ہے

خدائے عزوجل سے دعا ہے کہ وہ میری قلمی خدمتوں اور کوششوں میں کامیابی عطا فرمائے اور قارئین کے دلوں میں مندرجہ انعکاس واقعات سے عبرت آموزی کی طلب راسخ پیدا کر دے!

عطاء الرحمٰن خاں عطا وجدانی

مجبوری انسان کی سب سے
بڑی دشمن ہے۔
What a fine novel.

تمہید

مادرِ گیتی کی محبت بھری گود اچھے اور برے سب بچوں کیلئے کھلی ہوئی ہے مجھ جیسی سیکڑوں اس کی مہربان آغوش میں پرورش پا رہی ہیں اور اپنے بدبودار سانس اور دبی ہوئی مسموم آہوں سے فضا کو خراب کر رہی ہیں اور زہر آلود جراثیم پھیلا رہی ہیں جس سے فرزندانِ وطن متاثر ہوتے ہیں اور مرض متعدی بنکر زہر پھیلاتے ہیں۔ خود نیم مردہ ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں ــــ مجھے یہ احساس کیوں ہے؟ نہیں معلوم! کیا دنیا پہلے بھی ایسی ہوگی؟ نہیں معلوم! آنے والی دنیا کیسی ہوگی اس کا ایک خفیف سا احساس ضرور ہے۔ مگر مجھے اس آنے والی دنیا سے کیا تعلق؟ وہ دوسروں کی دنیا ہوگی! میری دنیا تو میں ہوں۔ ایک بسیط اور محیط دنیا!

ہاں! تو میں اب اپنی ڈائری لکھنا شروع کیا چاہتی ہوں مگر کیوں؟ ــــ تنہائی ہے سوچ رہی ہوں۔ کہ کیوں لکھوں؟ ــــ ٹھیک خیال آیا۔ اس لیے لکھوں کہ میں لکھ سکتی ہوں! یعنی میں پڑھی لکھی ہوں! ورنہ میری اس تعلیم سے جس پر مرحوم باپ نے ہزاروں روپیہ پانی

کی طرح بہایا۔ مجھے کیا فائدہ ہوا؟ ـــــ میں پھر خیالات کے الجھیڑوں میں پھنس گئی
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا خیال ٹھیک نہیں ہے۔ مگر۔ کیا میری تعلیم سے
مجھے اب تک فائدہ نہیں ہوا؟ کیا میں نے اس تعلیم کی بدولت بڑے بڑے
دانا و بینا لوگوں کو عقل و فراست کے علمبرداروں کو۔ دام تزویر میں
نہیں پھنسایا؟ کیا بڑے بڑے جلتے پرزوں کو اُلّو نہیں بنایا؟ سیکڑوں
تو مجھ پر ـــــــ مجھے یقین ہے ـــــــ اس لیے مرتے ہیں
کہ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ ذہین ہوں۔ طباع ہوں ـــ حاضر جواب ہوں۔
مرد کہتے ہیں مرد! ـــ کہ میں سخن سنج ہوں۔ آداب مجلس سے
واقف ہوں۔ بلکہ معلم آداب ہوں۔ با اخلاق ہوں۔ شریف طوائف
ہوں۔ شریف اور بے انتہا شریف!!!
کتنا کتنا زر لٹاتے ہیں اور میں کیسے کیسے چکے چھا نسے دیتی ہوں!
ـــ میں انتہائی مادی لذائذ کے ساتھ زیست پالتی ہوں ـــ کیا یہ سب
فوائد مجھے میری تعلیم اور قابلیت کی بدولت نہیں پہنچے۔ میں اگر اتنی تعلیم یافتہ
نہ ہوتی تو چالاکی مکاری۔ دھوکہ فریب اور دغا دینے میں اتنی مہارت
کیسے حاصل کر سکتی؟ تعلیم کے حاصل کرنے کا سب سے بڑا فائدہ اور
مقصد جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔ یہی تو ہے کہ تعلیم یافتہ انسان خوب
دولت کمائے۔ خوب کھائے پیے۔ مزے اڑائے اور عیش کرے اور
ایسا کرنے میں تعلیم یافتگی کے سب ہتھیار ـــ جن کو اجارہ داران
تعلیمات۔ حکمت عملی ـــ (پالیسی اور ڈپلومیسی) کے ناموں سے تعبیر
کرتے ہیں۔ کماحقہ استعمال کرے۔

لیکن کیا میں واقعی ڈائری اس لیے لکھوں کہ میں لکھنا پڑھنا جانتی ہوں؟ ـــ کوئی میرے اندر ہی اندر کہہ رہا ہے کہ یہ غلط ہے! تو کیا اس لیے لکھوں کہ تنہائی میں وقت اچھی طرح صرف ہوگا ـــ لیکن یہ بھی زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے ایک قسم کا عجیب یقین ہے۔ لیکن وجہ معلوم نہیں ـــــ کہ روزنامچہ لکھنے سے میری روح کو تسکین ہوگی!

تسکین اور روح؟ ـــــ میں اور روح و روحانیت اور مجھ میں! وہ روحانیت جس میں چھ سات سال سے کچل رہی ہوں فنا کر رہی ہوں ـــــ مگر وہ بڑی بیجا ہے میں ستر ہزار بار یہ سمجھنے کی یقینی کوشش کر چکی ہوں کہ وہ فنا ہوگئی مگر وہ جب دیکھو برقرار ہی ہے۔ چھائی ہوئی ہے۔ جسد خاکی کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے میرا عیش منغص کرنے کے لیئے۔ میرا مزہ کرکرا کرنے کے لیے! ـــــ یہ بھی کیا شے ہے؟ کیوں مجھے ستاتی رہتی ہے؟ اور اس کا احساس مجھے کیوں ہے؟ ـــــ ایک غیر مرئی۔ فرضی شے خدا جانے ہے بھی یا نہیں؟ مگر میرے لیے ہوّا بنی ہوئی ہے۔ جب دیکھو سر پر سوار ہے۔ لعنت۔ ملامت کرنے اور پھٹکارنے کے سوا اسکو کوئی دھندا ہی نہیں ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ میں اس کی سنتی بھی ہوں۔ اثر لیتی ہوں سننا اثر لینا کیا معنی۔ سننے اور اثر لینے پر مجبور ہوں۔

مگر کیوں؟ آہ نہیں معلوم۔ شاید تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے یہ سب ہو۔ مگر ـ یہ تو اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی کا مضمون ہوا۔ کیا میں اپنی تعلیم اور قابلیت کے زور میں اس سے منکر

نہیں ہو سکتی ؟ نہیں ہو سکتی ! میں نے صدہا بار کوشش کی مگر میری استعداد اور جرأت نے ہمیشہ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ۔ مذہب سے انکار کرنے والے اپنی علمیت پر زعم رکھنے والے بھی یوں ہی اپنی اپنی تنہائیوں میں میری طرح ہتھیار رکھ دیتے ہوں گے ۔

غضب تو یہ ہے کہ میری اس جانی دشمن "رُوح" کے نام بھی یارانِ طریقت نے کئی رکھے ہیں ۔ کبھی اس کو محض دماغ کے نام سے پکارتے ہیں ۔ کبھی اسکو دل کہتے ہیں ۔ کبھی ضمیر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی اس طاقتِ غیبی کو وجدان کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ——— مزید براں ۔ چند فلسفی ان سب کو علیحدہ علیحدہ متصور کرتے ہیں اور چند محض ایک ہی شے سمجھتے ہیں ——— کوئی کچھ کہے ! کوئی کچھ سمجھے ! مگر میں ہمیشہ سے یہ ضرور محسوس کرتی آئی ہوں کہ اس جسم خاکی کے اندر کوئی طاقت ہے ضرور جو ہم پر عجیب طریقہ سے حکومت کرتی ہے وہ ہم کو مکمل آزادی بھی بخشے ہوئے ہے ۔ لیکن ہر کام میں بر وقت ۔ مداخلت بھی کرتی ہے ۔ فرماتی رہتی ہے ۔ "یوں نہیں ! یوں کرو" "ایسا بالکل مت کرو"

"ایسا ضرور کرو" ہم مانیں یا نہ مانیں مگر وہ اپنی شانِ ملکوتی میں ضرور کہہ دیتی ہے ۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ہمارے ہر فعل کے بعد ہم کو اپنا فیصلہ بھی سناتی ہے ۔ وہ بھی مگر رعب زا آواز میں فرمایا کرتی ہے " یہ کام اچھا کیا ۔ وہ کام خراب کیا" لیجئے ! ہم سنیں یا نہ سنیں مگر وہ اپنا فیصلہ سنائے بغیر

نہیں مانتی اور ایک سنجیدہ حرکت یہ کرتی ہے کہ جب ہم مشغول بکار۔ منہمک یا مدہوش اور سرشار ہوں تو اپنا فیصلہ سنانے بہت کم تشریف لاتی ہے۔ لیکن جہاں ہم تنہا ہوئے اور چین سے بیٹھے تو یہ ملکہ فوراً تشریف لاتی ہے اور اپنے فیصلے سنانے شروع کر دیتی ہے اور بڑا زوردار محاسبہ کرتی ہے۔ اس وقت پیچھا بھی چھڑاؤ تو نہیں چھوڑتی۔ ہاتھ بھی جوڑو تو خاموش نہیں ہوتی۔ وہ وہ سناتی ہے کہ مزاج بحال ہو جاتا ہے۔ اس روحانی ملکہ کی حکومت کی شان یہیں تک ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ کسی حد تک سزا اور جزا پر بھی قادر ہے۔ اور جب کبھی سزا دینے پر آتی ہے تو ایسی مٹھی مار دیتی ہے کہ خدا کی پناہ تمام جسم کو کنکپا دیتی ہے۔ بدن کے روئیں کھڑے کر دیتی ہے۔ دنیا کا سب عیش حرام کر دیتی ہے۔ چہرہ کا رنگ فق کر دیتی ہے۔ کبھی بیمار بھی بنا دیتی ہے۔ حتی کہ کبھی کبھی خودکشی کرا کے جان لے لیتی ہے۔ البتہ جزا دینے کے معاملہ میں ذرا بخیل واقع ہوئی ہے۔ اور یا یہ کہ ہم اس کے بخشے ہوا انعام واکرام کو واقعی طور پر محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ یہ غیبی ملکہ جزا دینے میں بھی بڑی فیاضی سے کام لیتی ہے۔ نہال کر دیتی ہے۔ بیڑا پار کر دیتی ہے۔ اتنی زبردست مسرت بخش دیتی ہے کہ تمام دنیا کی نعمتیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر یہ فیاضی اس وقت ظہور میں آتی ہے جبکہ یہ ملکہ قربانی ایثار اور کھینٹ لیکر خوش ہوتی اور جوش میں آتی ہے۔ یہ کھینٹ عام طور پر جذبات کی قربانی لذات کا ایثار۔ رغبت اور تحریص کا خون ہوتا ہے۔ اس ملکہ کو یہ قربانی وعدہ کے

پاک ہاتھوں میں خنجر انفعال لیکر خواہشات کے ذہنوں کی موٹی موٹی گردنوں پر چلا کر دیجاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ بردبار چشم پوش، شہ زور او رشان تغافل کے ساتھ حکومت کرنے والی کوئی غیبی ملکوتی برقی قوت ہے جس کا مرکز دل اور دماغ ہے۔ اور یا یہ قادر مطلق کی بے نیازانہ خدائی کا ایک غیر مرئی عہدہ دار ہے جو انسانی دل و دماغ پر مسلط ہے اور ارشادات قدرت کی تعمیل کرتا رہتا ہے۔ ——— روح یا ضمیر ——— یا ——— روح اور ضمیر ——— کتنی محیر العقول اور مسلم نفسیات ہے ——— صناع ہیچوں کی کارسازیوں کو کوئی کتنا کتنا اور کس طرح سمجھے

وجود خود کو جو سمجھا نہیں قدرت کو کیا سمجھے
جو ہو مخلوق وہ خالق کو کتنا اور کہاں سمجھے!

والد صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ضمیر اور نفس دیکر انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا اور اوامر و منا ہی کے دریا بہا دیئے گئے۔ کائنات میں انسان کو موجود کیا گیا اور اپنی راہ پر چھوڑ دیا گیا۔ ضمیر کے اتباع کرنے والوں کے لیے کسی دوسری ابدی دنیا میں جنت بنائی گئی اور نفس سے دھوکہ کھانے والوں کے لیے ابدی یا میعادی سزا کے لیے دوزخ بنایا گیا۔ مگر آج میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس جنت اور دوزخ کا لا نظر آنیوالا نمونہ اس دنیا میں بھی قایم ہے جس پر ضمیر اور روح کی ملکہ محدود خدائی کرتی ہے۔ بہت سے چھوٹے موٹے اعمالوں کی سزا اور جزا یہ ملکہ یہیں دے لیتی ہے۔ اس سحر آفریں ملکہ کے حکم سے جس کو سزا دیجاتی ہے

اس کی دنیا فوراً بدل جاتی ہے اور جس کو جزا ملتی ہے اس کی دنیا بہشت بنجاتی ہے۔ یہ سب معنوی۔ باطنی۔ وجدانی۔ نفسیات کے مبادیات اور مسلمات ہیں۔ جن سے صحیح الخیال افراد انکار نہیں کر سکتے۔ میری طرح بدیہی طور پر مادی طور پر ہزاروں انسان صدائے ضمیر کے انحراف اور بداعمالیوں میں بھی خوش وخرم ہشاش بشاش اور چاق چوبند نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے دل کی گہرائیوں سے پوچھو۔ ان کے معنوی وجود پر غور کرو۔ ان کی باطنی آواز کو سنو۔ ان تنہائی اور عالم خیال کی چیخوں کو سنو۔ ان کی دنیا۔ میری دنیا کی طرح۔ دوزخ سے بھی بدتر نظر آئے گی قلبی بے چینی کی بھڑکتی ہوئی چنگاریاں انفعال کے شعلے کرتوتوں کو چھپانے کی پوشیدہ خلش بھیانک جرایم کے خمیازوں کے زخم حصول خواہشات کی ناکامی کی نمک پاشیاں۔ افشا کے خوف کی لرزہ براندامی کلیجہ کی جلن۔ جگر کی خوں فشانی۔ دماغ میں نفسانی ہیجان کی شرر باری ——— ان کی معنوی دنیا ہے۔ جس میں وہ بستے ہیں۔ جس کے اوپر وہ تصنع کی چادر۔ ہنگامی اور عارضی عیش کا جھالر ڈالے ہوئے ہیں اور چادر کے کونوں پر ریاکاری اور بے ہوشی کی مدہوش کن شراب کے بھاری خم رکھے ہوئے ہیں کہ کہیں سمت راست سے ہوا چلنے پر چادر کے کونے اٹھکر حقیقت کو افشا نہ کر دیں!۔ مگر ان کو اور مجھ کو روح فرسا احساس اور یقین ہے کہ ہم چادر کے نیچے دوزخ کو چھپائے ہوئے ہیں۔ جس کی لپٹوں سے بچنے کے لیے ہم انھیں بھاری خموں سے جام پر جام پیکر بے حسی اور بے ہوشی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ انسان ——— بے کس انسان! بس اتنا ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی شاید

اس لیے کر سکتا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اور یہ اس کی انسانی قدرت اور فضیلت کا قوی ترین استعمال ہے۔

روزنامچہ کا سرورق کیا لکھنا شروع کیا بالکل بھٹک گیا اور وہ لکھنے لگی جو مجھے زیب نہیں دیتا ——— ہاں! تو میں لکھنا یہ چاہتی تھی کہ ایک صدا جو ابتداً نحیف تھی مگر اب زوردار ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیشہ مجھے آتی رہی ——— میں اس کو خوب پہچانتی ہوں۔ خوب جانتی ہوں یہ اس روحانی ملک کی صدا ہے۔ وہ کہتی رہتی ہے ——— کمبخت لیلیٰ! کبھی تو سکون کے تلاش کرنے کی کوشش کر! اور کسی طریقہ پر تو معنوی تسکین ڈھونڈھ"! ——— میں اس صدا پر غور کرتے کرتے آج اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ اپنا روزنامچہ لکھا کروں' جو میری زندگی کی جائیوں اور ان کی نفسیات کا آئینہ دار ہوگا جس میں اپنی اصل صورت دیکھا کرونگی۔ جس سے مجھے ایک گونہ سکون میسر ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ روزنامچہ میرے مرنے کے بعد کسی میرے ادیب یا مالک مطبع عاشق کے ہاتھ آجائے اور اس کو مطبع کی روشنائی کا رہین منت بنا کر عیاشوں کی گردن پر احسان کا بار گراں رکھدے اور ان کے پوشیدہ گناہوں کو اتنا اچھالے کہ وہ اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ اور شرم سے منہ چھپالیں! اور عیاشی سے منہ موڑیں! ——— یہ کتنا اچھا خیال ہے۔ مجھے تکمیل سے بیشتر ہی مسرور کر رہا ہے۔ کاش میں سکون حاصل کر سکوں!

میں اپنا روزنامچہ شروع کرنے سے پہلے یہ ضروری خیال کرتی ہوں کہ یکم جنوری ۱۹۳۰ء سے پہلے کے واقعات کا ایک ہلکا سا خاکہ اس ڈائری کے شروع میں درج کردوں جس کے بغیر یہ غیر تکمیل یا شائد مہمل ہوگی۔

میں ۱۹۱۱ء میں بمقام امروہہ پیدا ہوئی — میرے والد صاحب مرحوم ایک تحصیلدار تھے وہ نہایت وجیہ اور خوش رو انسان تھے بڑے خلیق اور ملنسار تھے۔ میری والدہ کا نام فدائی تھا۔ اور مجھے بچپن میں یاقوت کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ میں نے زندگی کے بارہ سال انتہائی نازونعم میں اور شفیق ماں باپ کی آغوش میں گزارے۔ مجھ کو خاندان کا ہر فرد سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا میں نازوں کی پالی لاڈلی بیٹی تھی۔ میری تعلیم کا بچپن سے غیر معمولی انتظام کیا گیا تھا۔ اور میں نے بارہ سال کی عمر میں کافی تعلیم اور تربیت حاصل کرلی تھی بچپن سے ذہین تھی اور مولوی شبیر حسین جیسے عالم اور فلسفی سے میں نے بہت کچھ حاصل کرلیا تھا۔ مگر افسوس کہ میری عمر بارہ سال سے زیادہ نہ ہوئی تھی کہ ۱۹۲۳ء میں میرے سر سے میرے شفیق باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ اور میری دنیا تاریک ہوگئی۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی رشتہ داروں نے آنکھیں پھیرلیں میں اکلوتی بیٹی تھی اور ایک بڑی جائداد کی وارث تھی لیکن میرے چچا اور تایا ابا نے ہم ماں بیٹیوں کے ساتھ ایسا برا سلوک کیا کہ جس کو یہاں لکھتے ہوئے بھی میرا کلیجہ کانپتا ہے۔ مجھ کو اور میری ماں کو کئی بار زدوکوب کیا گیا طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں ہمارے تمام زیورات چھین لیے گئے کوڑی کوڑی کو محتاج کردئے گئے۔ اور

وراثت پر مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ میرے ماموں نواب احمد صاحب نے بہت کچھ زور لگایا۔ مگر مقدمہ کا فیصلہ خدا جانے کیوں ان لوگوں کے حق میں ہوا اور ہم اب بالکل مایوس ہوگئے۔

آخرش میری والدہ نے بڑی ہوشیاری سے ان کے مکان میں کچھ روپیہ اور زیورات کی چوری کی اور مجھ کو لیکر شب کی تاریکی میں مکان سے باہر نکل آئیں میں نے اپنی والدہ کی اس حرکت کو بُری نگاہ سے دیکھا۔ مگر مجبور تھی ان کا حکم ماننا پڑا۔ کچھ دور فاصلہ پر ایک تانگہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ جس میں ماموں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میرے ماموں مراد آباد میں رہتے تھے اور بہت کم امروہہ آتے تھے اور جب آتے تھے تو سوائے میرے اور کوئی ان کو دیکھ کر خوش نہ ہوتا تھا۔ بلکہ سب ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ الغرض ہم مراد آباد کے ایک آراستہ پیراستہ مکان میں پہنچ گئے مجھ کو ماموں نے سمجھایا کہ میں ہارمونیم بجانا اور کچھ گانا اس لیے سیکھ لوں کہ ایسا کرنے سے مجھ کو کوئی جنٹلمین اور امیر کبیر شوہر مل جائے گا۔ اور کسی دولتمند کے ساتھ شادی ہونے سے میرے خاندان کی تکلیفیں ختم ہو جائینگی مجھ کو پہلے سے کچھ باجا بجانا آتا تھا۔ اور متعدد غزلیں زبانی یاد تھیں۔ جن کو اکثر گنگنایا کرتی تھی۔ میں نے ذرا سی محنت میں باجا بجانا اور گانا سیکھ لیا۔ اور اس سلسلہ میں ایک عورت نے جس کو میری خالہ بتایا گیا اور جس کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا بڑی مدد کی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ میری والدہ بھی بہت اچھا گا لیتی تھیں۔

اب ہم کو پھر اچھا کھانے پینے کو ملنے لگا اور میں بے پردہ ہوکر اپنی والدہ اور خالہ کیساتھ سینما اور تھیٹر وغیرہ میں جانے لگی اور اب مجھ کو یہ کہکر کہ " سینما میں نوکری کرائینگے " ناچ کی بھی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی - میں نے یہ سب کچھ اس لیے دل لگاکر سیکھا کہ میں سمجھتی تھی کہ ایسا کرنے سے میں اپنی والدہ اور ماموں کی تکالیف کو اپنی تنخواہ کے ذریعہ بہت کچھ دور کرسکونگی -

بالآخر دن آیا کہ میں سن شباب کو پہنچی - اور میرا دل دھڑکنے لگا میں چونکنے لگی - اور سمجھ گئی وہ جو میں کبھی خواب میں بھی سمجھنا نہ چاہتی تھی ! مجھے معلوم ہوگیا کہ میری والدہ اور خالہ کے پاس ہر روز نئے آدمی کیوں آتے ہیں - مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ میرے ماموں جان کی اصلیت کیا ہے اور مجھے اب یہ بھی خیال آنے لگا کہ میرے ساتھ کیا حسن سلوک ہوگا ؟ لیکن پوچھنے پر مجھے ہمیشہ یہی تبلایا گیا کہ میری شادی کسی شریف انسان کے ساتھ کی جائیگی - یا مجھے سینما میں نوکر رکھا یا جائیگا

وہ دن میں کبھی نہ بھولونگی جب مجھے یہ روح فرسا یقین ہوا کہ شادی سے پہلے میری والدہ ایک طوائف تھی لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اس نے میرے والد مرحوم سے نکاح کیا تھا یا نہیں ؟ اب میں یہ بھی سمجھ گئی کہ ہم کو کیوں جائداد سے محروم کیا گیا اور کیوں ہم پر ظلم وستم روا رکھے گئے حالانکہ قانون اور شرع کی نگاہ میں ہم جائز وارث معلوم ہوتے تھے -

اس مرکان میں نوجوانوں کی بیباکانہ آمد اور میرے سنگار کی علت غائی -

ان کا مجھے بُری نگاہ سے گھورنا اور گندہ مذاق کرنا یہ سب مجھے کاٹے کھاتا تھا۔ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر میں مجبور محض تھی، دم بخود اور لب بند میرے خیالات پر ماحول نے گردوپیش نے اور میرے ماموں اور والدہ کی ترغیب و تحریص نے کارفرمائی شروع کی جس میں کبھی کبھی ڈانٹ بھی شامل ہو جاتی تھی اور کبھی اپنی مالی مشکلات اور گزر اوقات کے اہم ترین سوال کو انتہائی کس مپرسی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دن آیا کہ میں نے اس شرط پر کہ میری شادی کسی سے ضرور کر دی جائے۔ گانا اور ناچنا شروع کر دیا ———— اب کیا تھا تماش بینوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ کبھی تو یہ بھی ہوتا تھا کہ کمرہ میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔ اسقدر دولت کی افراط ہوئی کہ قیمتی قیمتی زیور اور بڑھیا کپڑے تیار کرائے گئے اور صندوق بھر دئے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری والدہ پھر جوان ہونے لگی۔ اور ماں بیٹوں پر بہنیں ہونے کا دھوکہ ہونے لگا ————

میرا نام "لیلیٰ" رکھا گیا اب مجھے یاقوت کوئی نہ کہتا تھا آہ! میرا بچپن! اور بچپن کا پیارا نام!

امروہہ کے باشندوں میں سے مجھے رفیق کی یاد اکثر ستاتی تھی جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں سنتی چلی آئی تھی کہ اس سے میری شادی ہوگی۔ وہ بڑا اشر سیلا تھا۔ خوب صورت تھا میرے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اور لڑکوں لڑکیوں کی لڑائی میں ہمیشہ میرا ساتھ

دیتا تھا جس پر اس کو چڑایا جاتا تھا میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس کو ایک خط لکھوں۔ مرادآباد بلاؤں اور اس سے ملوں۔ مگر اپنے واقعات حاضرہ اور گرد و پیش کی مشکوک و مکدر فضا کی وجہ سے ہمت نہ پڑی۔

وقت گذرتا گیا اور میں جوان ہوتی گئی۔ میری والدہ اور خالہ اور ماموں جان ہمیشہ ہی منگنی کی باتیں میرے سامنے کرتے رہے جن سے تصنع کی بو آتی۔ اور میں جھنجھلا جاتی لیکن خاموش رہتی اور اچھی توقعات قائم کرنے پر اکتفا کرتی میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس مکان کی چار دیواری سے نکل کر وسیع دنیا کے کسی گوشہ میں جا بسوں اور جو گذرے سہوں مگر ہمت نہ پڑی حوصلہ نہ ہوا۔ اور ارادہ سمٹ کر رہ گئی کاش! اپنے اس ارادے پر کاربند ہو سکتی! ۔آخرش دن آیا کہ اچانک مجھ کو اپنے خوابگاہ میں جاتے ہی ایک نوجوان لیٹا ہوا دکھلائی دیا جس کی مسکراہٹ نے میرا خیر مقدم کیا۔ جس کے تیوروں نے مجھے بوکھلا دیا جس کے اطمینان کے سانسوں نے مجھے مبہوت کر دیا۔ میں بیحد حیران اور سراسیمہ ہو گئی۔ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی میں نے سب کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اور پوچھا۔ "آپ یہاں کیوں سرہانے لاؤ؟" ——جواب ملا—— "آخاہ! اتنی بھولی ہو!" اس جملے سے میں سب کچھ سمجھ گئی۔ اور میں نے کڑک کر کہا "عزت کے ساتھ تشریف لیجائیے ورنہ اچھا نہ ہوگا" اس جملے کو سنکر اس نے قہقہہ لگایا وہ اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ میرا خون جوش میں آیا۔ رگ حمیت پھڑپھڑائی اور میں نے اپنی پوری طاقت سے اس کے کان اور گال پر ایک طمانچہ لگا دیا ——— اب آگے کیا لکھوں وہ چلا گیا۔

جھلایا۔ ماموں آئے۔ ماں آئی۔ خالہ آئی۔ باتیں ہوئیں۔ مجھے ماموں اور والدہ نے خوب پیٹا۔ اور وہ شخص جس کی خوفناک صورت میں کبھی نہ بھولونگی میری والدہ کو۔ ماموں کو اور مجھے گالیاں دیتا ہوا۔ چلا گیا میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر رات بھر نہ سو سکی۔ میرے خیالات کا سمندر تھا جس میں ڈوبتی تھی۔ اُبھرتی تھی۔ چونکتی تھی اور ڈرتی تھی مجھے اپنا باپ! ——— یاد آیا ——— اور میں چیخیں مار کر رونے لگی۔

مگر تعجب ہے کہ مجھے کوئی منانے نہ آیا آنسو دنیا میں بیش بہا نعمت ہے جو دُکھ درد اور مصیبت کا ساتھی ہے۔ اگر آنسوؤں کی ابتدائی عصبیاتی حالت تکلیف دہ نہ ہوتی تو شاید تمام دنیا کا بہترین شغل رونا ہی ہوتا۔ آنسوؤں کا انجام ہمیشہ اطمینان بخش سکوت اور سکون ہوتا ہے ——— کلیجہ میں ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور انسان تھوڑی دیر کیلیے بڑے سے بڑے غم کو بھول جاتا ہے۔ بڑی عمر میں انسان شاید کچھ بیوقوف ہو جاتا ہے اس لیے اکثر نہیں روتا لیکن بچپن میں وہ ہمیشہ آنسو سے استفادہ کرتا ہے۔ جو عین فطرت اور دانش ہے! ———

دو تین دن کے بعد مجھے میرے گھر والوں نے سمجھایا بجھایا منت سماجت کی اور اپنی والدہ کے آنسوؤں پر مجھے رحم آگیا میں نے پھر گانا ناچنا شروع کر دیا۔ لیکن ایک ہفتہ کے بعد پھر اسی قسم کا جانکاہ حادثہ پیش آیا اور اس کا قریب قریب وہی انجام ہوا۔ ———

تقریباً ایک ماہ کے بعد ہماری سب کی ایک رئیس کے یہاں دعوت ہوئی اچھے اچھے کھانے کھائے گئے۔ میرا ناچ اور گانا ہوا۔ اور شب کے دو بجے کے بعد مجھ کو اس بڑے احاطہ کے دوسرے بنگلہ میں لیجایا گیا اور والدہ۔ خالہ۔ اور ماموں مجھے ان رئیس صاحب کے پاس تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اور میں سہم گئی رئیس صاحب بھی تاڑ گئے۔ اور دلاسا دینے لگے۔ کہنے لگے۔ لیلیٰ "گھبراؤ نہیں میں ایک عالی خاندان شریف انسان ہوں" —— وہ شریف انسان! عالی خاندان! میرے شریفانہ جذبات اور اظہار خیال پر وحشیانہ ہوس کی آگ میں جل گیا اور اپنی شرافت کے سب ہتھیار تیز کرنے لگا اور دانت پیسنے لگا۔ شرافت کا مظاہرہ یہ تھا —— تین ہٹے کٹے نوکر بلوائے گئے۔ جنھوں نے زبردستی پکڑ کر مجھ کو ایک چھوٹے کمرے میں ڈھکیل دیا رئیس صاحب آئے میری بے بسی پر ہنسنے لگے۔ اور غضب یہ کیا کہ اظہار عشق بھی فرمانے لگے۔ جس سے میری آتش غضب اسقدر مشتعل ہوئی کہ میں اپنی تمام نسوانی طاقت کے ساتھ ان پر برس پڑی۔ دو چار ہاتھ لگانے پائی تھی کہ پھر ان کمبخت نوکروں نے مجھ کو پکڑ لیا۔ اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ اور وہ شرمناک حرکتیں میرے ساتھ کی گئیں جن کو لکھنے سے میرا قلم کانپتا ہے اور کلیجہ تھراتا ہے۔ میں یقیناً نہیں لکھ سکتی۔ اور لکھوں بھی تو کیسے؟ میں ہی نہیں۔ کوئی بھی نہیں لکھ سکتا۔ میری چادر عصمت چاک کر ڈالی گئی۔ میری نسوانیت حلال کر دی گئی اور یہ سب کچھ کرنے میں مجھے زدوکوب بھی

کیا کیا کہ میں کئی بار بیہوش ہو ہو گئی ـــــ یہ سب کس نے کیا؟ ایک عالی خاندان اور شریف انسان نے جو مجھ پر عاشق تھے اس شریف زادے کے عشق کی یہ انتہا تھی! ـــــ عالی خاندانی۔ شرافت انسانی ہو اُن کے عشق کی یہ تصویر اسقدر بھیانک ہے کہ اس پر پڑے ہوئے پردوں کو اُٹھانے اور اس کو کماحقہ بے نقاب کرنے کی ہمت بھی منافیِ شرافت۔ دالخراش حیا سوز ہے! ـــــ ـــــ

اے عالی خاندان شریف انسانوں! اے عشق بازو! ہوس پرستو! میرے جذبات کو پہچانو! اور اپنے ہی جیسے عالی خاندان ایک تحصیلدار باپ کی بیٹی کی حالت پر غور کرو اور اُس کا طلاق اپنی بہن بیٹیوں پر کرو ـــــ کانپ اٹھو گے ـــــ لرز جاؤ گے۔ کمبختو! ڈوب مرو۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرو ـــــ تم خبیث ترین انسان ہو۔ شیطانی خون سے بدتر ہو۔ والی گمراہی زدنی ہو۔ تم سے تو ہزار درجہ بہتر وہ انسان ہیں جو عالی خاندانی اور شرافتِ انسانی کے دعویدار نہیں مگر ان کے دل شرافت نفسی سے ہمدردی اور رحم و کرم سے اخلاق کے نور سے معمور ہیں ـــــ

کہاں ہے قانون وقت! کہاں ہیں انصاف کے علمبردار۔ کہاں ہے مجلس قانون ساز! کہاں ہیں مقننین اور شارعین! آئین ہمیں مجھے بتائیں کہ کیا یہ حرکت یہ فعل قوانین اور تعزیرات ہند کے دفعات کے تحت جرم سنگین نہیں ہے؟ کیا یہ جرم قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے؟ کیا اس جرم کا نام "زنا بالجبر" نہیں ہے؟ کیا ان کی

ایک حرکت کو "حبس بیجا" نہیں کہہ سکتے؟ مجروح کر دینے والی زدوکوب کو "ضرب شدید" کا جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔؟ تین سنگین جرائم اور تینوں قابل دست اندازی پولیس! لیکن طرفہ تماشہ ہے کہ میں مکان پہنچکر زمرہ عشاق میں سے ایک پولیس آفیسر کو سب ماجرا دلدوز رقت کے ساتھ سناتی ہوں، بتاتی ہوں۔ ان کا فریضہ جتاتی ہوں مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی "عالی خاندان شریف انسان" بلکہ باحکومت، ہستی ہیں اور اس سے زیادہ قبیح جرم کے ارتکاب کے ارادے کو آغوش میں پرورش کر رہے ہیں۔ کیا حکومت وقت انکار کر سکتی ہے کہ میں دوسری لڑکیوں کی طرح حکومت کی بیٹی نہیں ہوں؟ کیا میری عزت وناموس کی حفاظت اس کا فرض نہیں ہے۔؟ کیا میں دنیا کی نگاہ میں ایک شریف تحصیلدار کی لڑکی نہیں ہوں؟

میں اب گندے مکان میں سانس لے رہی ہوں یا ایک کسبی ماں کی سرپرستی میں ہوں۔ لیکن قانون کو اس سے کیا تعلق؟ اس کی نگاہ میں ہر دوشیزہ کی عصمت کی حفاظت اس پر لازم اور واجب ہے بلکہ کسی حد تک زیادہ ——— کیونکہ ان سرپرستوں کی نیت اور مکان کی فضا مخدوش ہے۔

تمدن سوسائٹی اور سماج کے اجارہ داروں کو چاہیئے کہ وہ اس قسم کے واقعات اور حادثات سے چونکیں۔ جاگیں اور حکومت وقت سے قانون متعلقہ زنا بالجبر میں مناسب ترمیم کرالیں اور ہم بھی

کس ہیرس لڑکیوں کو طوائف بننے سے بچالیں بنی نوع انسان پر احسانِ عظیم کا بارِ گراں رکھیں ۔ ورنہ یہی لڑکیاں پھر منبع و مخرجِ جرائم بنکر نقضِ امن ۔ تخریب اور انحرافِ قوانین کا باعث ہوں گی اور ہوتی رہیں گی ۔۔۔

میرے نزدیک قانون میں مندرجہ ذیل ترمیم کی جائے اور اس کے نفاذ اور عمل پر سخت توجہ کیجائے ۔

کسی دوشیزہ کے خواہ وہ لڑکی طوائف ہی کی بیٹی کیوں نہ ہو اور واضح اظہار رضامندی کے بغیر مباشرت کا فعل زنا بالجبر اور ہر عورت کے موافق اور واضح اظہار رضامندی کے بغیر ہر اس شخص کا فعل مباشرت جو شوہر نہ ہو زنا متصور ہوگا ۔

نوٹ ۱: طوائف ماں یا کسی باپ کو اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف مباشرت کی اجازت دینا جرم سمجھا جائے گا ۔

نوٹ ۲: کسی شوہر یا سرپرست کا اپنی بیوی یا کسی عورت یا بیوہ کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف یا اس کی مرضی سے کسی شخص کو مباشرت کی اجازت دینا جرم ہوگا ۔

نوٹ ۳: ہر دو جرائم قابل دست اندازی پولیس ہونگے سرکار مدعی ہوگی ۔ اور سزا تین سال سے سات سال کی قید بامشقت ہوگی انسدادِ جرم اور دست اندازی پولیس کے لیے کوئی مدت معین نہ ہوگی ایسا کرنے سے ۔ مجھے یقین ہے ۔ کہ کسبیوں کے حوصلے شکست ہو جائیں گے ۔ اور گنہگار افراد طوائفوں کی تعداد اور جرائم بیحد کم ہو جائینگے

ان واقعات کے بعد میں نے خودکشی کی رائے کئی بار قائم کی ۔ مگر خدا جانے کیوں عمل نہ کر سکی ۔ اپنے ان گرگ صفت رشتہ داروں کے کلیجوں میں خنجر گھونپنے چاہے ۔ مگر خدا جانے کیوں نہ گھونپ سکی !

اس قسم کے دو چار واقعات پیش آنے پر رفتہ رفتہ میری حیا و حمیت مجھ سے رخصت ہونے لگی ۔ منہ کو خون لگ گیا جذبۂ حیوانی میری ہستی پر مسلط ہو گیا اور میں ایک اچھی خاصی طوائف بن گئی ۔ لیکن دنیا کے بڑے سے بڑے واقعے سے بھی میری روح نہ مر سکی ۔ وہ جوں کی توں ہی رہی مگر قدرے ماؤف اور ناتواں ضرور ہو گئی اور اسکی صدا کچھ دھیمی ہو گئی۔

لیلیٰ کی ڈائری

۷/جنوری ۱۹۳۰ء

محفل رقص و سرود گرم تھی شراب عشق سے عشاق کے دل گرم تھے۔
بازار حسن گرم تھا۔ خوب لین دین ہو رہی تھی۔ میرے گالوں کی سرخی سے
آنکھیں۔ سینکی جا رہی تھیں۔ ساز آپ سے باہر تھا۔ نغمہ دلوں کو برما رہا
تھا۔ میری تانیں آسمان کو سر پر اٹھا رہی تھیں گھونگھرؤں کی آواز
عشقبازوں کے دلوں کے پار ہوئی جا رہی تھی۔ میری آواز کے زیر و بم
اور میری متوالی نرت لوگوں کو جھومنے پر مجبور کر رہی تھی۔ دلوں کو کھینچ
رہی تھی۔ آہیں بھروا رہی تھی۔ آتش اشتیاق تیز کر رہی تھی جنوں کو جوش
دے رہی تھی۔ مجھے اپنی کامیابی کا احساس تھا۔ سحر کاری پر ناز تھا۔

عشاق کے دلوں کو میں مسحور اور مسخر کر رہی تھی۔ اور خوش ہو رہی تھی گگال تمتمارہے تھے۔ اظہار میں عجلت تھی طبع میں جودت تھی قلب میں گرمی تھی۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔ دل اچھلتا تھا۔ مچلتا تھا۔ میرے سازندے آنکھیں ملتے ہی اپنی اور میری کامیابی کو آنکھوں میں کہدیتے تھے۔ میری والدہ اور خالہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھیں۔ سارنگی روپیوں سے بھری جا رہی تھی۔ نوٹ پر نوٹ ٹھن رہے تھے۔ رگ تفوق کی ضد کارفرمائی کر رہی تھی اور کئی کو بیوقوف بنا رہی تھی چند عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے میرے ہاتھوں کو روپیہ پر روپیہ اور کبھی کبھی نوٹ پر نوٹ لینے کی تکلیف دے رہے تھے۔ میں لے رہی تھی۔ خوشی سے انگلیوں میں لیتی تھی۔ تسلیم بجالاتی تھی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ اس روپیہ کا دس فیصدی حصہ بھی میرے کام نہیں آئیگا۔

حسن وعشق اور دولت کی اس گرم محفل میں ایک سرد دل انسان بھی تھا جو ایک کونے میں گردن جھکائے چشم نیم وا کئے بیٹھا تھا۔ ساکت اور صامت تھا۔ اس عجیب اور دلچسپ انسان پر میری نگاہ فتنہ باز اٹھتی ہوئی پڑتی تھی اور میں خود فراموشی کا ایک جھٹکا محسوس کرتی تھی۔ اس کی بے نیازی سے جسم میں سنسنی پیدا ہو رہی تھی لیکن میں اپنے جذبات پر چشم زدن میں قابو پا جاتی تھی۔ گانا ختم ہوا۔ گفتگو ہوا کی۔ فقرہ بازی ہوتی رہی چٹکیاں لی گئیں میرے دل پر قابلیت اور فہم و فراست کا سکہ جمانے کی کوشش کی گئی۔ بڑے نخروں سے پان کھائے گئے۔ بڑے انداز سے اگالدان بڑھائے اور ہٹائے گئے۔ ذہین عیاشوں نے ذہانت کا

ندہ اٹھایا میرا ردو نے سخن اپنی طرف پھرایا اور اسی کو معراج
کاوت سمجھا ___ کچھ چلے گئے تھے ۔ کچھ موجود تھے ہمکلام تھے۔
ر وہ یخ لبستہ جذبات والا انسان جوں کا توں کونے میں ہی رہا۔
ب لفظ نہ بولا ___ حالانکہ میں نے کئی بار اُس کی طرف نظر اٹھائی
رجمائی ۔ مگر بے حسی کا مالک ! خاموشی کا بُت ! ٹس سے مس نہ ہوا !
ب سب چلنے لگے ۔ تو خود بھی کھسک گیا

ہم گھر کے آدمیوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے
ئے ۔ میری خالہ اور والدہ کے پاس حسبِ معمول ایک مرد تھا۔
میں اپنے کمرے میں تنہا تھی ۔ ناچ کی تکان دور کرنے کے بعد
نے کئی بار اس خاموش انسان کے متعلق سوچا اور کچھ نہ سمجھ سکی۔
اجانے کون ہوگا بیچارا ! ___

۹/ جنوری ۱۹۳۰ء

گذشتہ پانچ چھ سال کے دوران میں میں اور گھر والے اس نتیجہ پر پہنچ
گئے تھے کہ میں اپنی خلوت کا شریک اس شخص کو بنا لیا کروں گی جو مجھے
پسند نہ ہوگا مگر اُن کو یا کسی کو کوئی حق نہ ہوگا کہ مجھے ہر کس و ناکس
ساتھ شب باش ہونے پر مجبور کریں ۔ اس کو اپنی نسبت یہ پاک مجاہدہ

کہتی ہوں ۔ خدا جانے یہ کہاں تک سچ ہے ! ــــ اب خاص قسم کے حسین مردوں کی بن آئی ۔ انھوں نے میری نظر کو پہچانا اور والدہ کو دبا لیا خدا جانے وہ کہاں تک رہیں ۔ یا کیا کیا ہوا گیا ــــــــــ

چنانچہ آج سر شام ہی سے مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے بستر کا شریک ایک نوعمر خوشرو انسان ہے ۔ جو ابھی سے آپ سے باہر ہوا جا رہا ہے ۔ اور اپنی چھوٹی مونچھوں کو تاؤ پر تاؤ دیکر شاید جڑ سے اکھاڑنے کی غیر معلوم کوشش کر رہا ہے ۔ ناچ ختم ہوا ۔ گانا شروع ہوا ۔ کچھ نئے کچھ پرانے لوگ آئے کچھ بیٹھے رہے کچھ چلے گئے ۔ کسی نے بات کی ۔ کسی نے نہ کی ۔ کچھ نے مجھکو پسند کیا کچھ نے ناپسند ــــــــــ پسند کرنے آتے ہیں کمبخت بدمعاش ایک تحصیلدار کی لڑکی کو ! ــــــــ مگر انھیں کیا معلوم ! خیر ــــ میں نے دو چار داغ کی غزلیں گائیں ۔ واہ ملی ۔ روپیہ ملا ۔ واہ واہ ہوئی ــــــــ مگر خاموش انسان نے ۔ اُس مٹی کے بت نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا ۔ جس پر مجھے بڑا غصہ آیا ۔ اور میں نے اس کو بنظر قہر دیکھا مگر اس کی نگاہ میں ۔ نیاز کا سرچشمہ دیکھکر میرے جسم نے غیر محسوس پھریری لی ۔ اور میں نے اسی کو اپنے غرورِ حسن کے لیے ایک تازیانہ سمجھا ۔

خاموشی بھی کتنی بڑی چیز ہے ! کتنے معنی ۔ کتنی طاقت رکھتی ہے ! کہیں عقل کی بہترین تصویر ۔ کہیں حماقت کا بدترین مرقع ۔ کہیں طاقت و جبروت کی برقی قوت ! ۔ کہیں کشش ہو دلآویزی کی مقناطیسی صورت ! ۔ یعنی

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

صورت قال جو واضح کیا جائے وہی معنی رکھتی ہے مگر صورت حال سیکڑوں معنی رکھتی ہے اور سیکڑوں ہزاروں تاویلوں کی طالب ہے ——— میں جب ——— ہاں! جب میں خاموش ہو جایا کرتی ہوں ۔ جس کی وجہ کچھ بھی نہیں ہوا کرتی ——— تو عشقبازی کی دنیا کا نظام درہم برہم ہو جایا کرتا ہے ۔ کتنی کتنی خوشامدیں لوگ کیا کرتے ہیں! کتنی کتنی بیتابیوں کے مظاہرے ہوا کرتے ہیں! اور میری خاموشی پر عشاق کی تاویل ——— تذبذب اور تالیف! ——— یہ سب ——— کتنی لطیف شکلیں اختیار کرتے ہیں ۔ جس سے میں بے انتہا لطف اندوز ہوتی ہوں ——— میں نے ارادہ کیا کہ اس خاموش ہستی کو خوش کرنے کے لیے ۔ میں خود سلسلہ جنبانی کروں اور اس کے استحکام خموشی پر وہ سب کچھ کروں جو لوگ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں مگر ہمت نہ پڑی اور فوراً خیال آیا کہ میری طرح اس کے جذبۂ غرور کو تسکین ہو گی چونکہ یہ حرکت میری ظریفانہ ذہنیت کے خلاف اور پیشہ کی کامیابی کے منافی تھی ۔ لہذا جبر کر گئی ——— یہ سب خیالات مجھے اس وقت آرہے تھے جب کہ میں پان لگا رہی تھی ۔ اور لوگ آپس میں رمز و کنایہ کے ساتھ سرگرم گفتگو تھے ۔ لیکن اس خاموش انسان کا کوئی دوست نہ تھا ۔ اس سے کوئی بات نہ کرتا تھا ۔ یہ عجیب بات تھی اور میرا اولین مشاہدہ تھا ۔

آخر ش میں نے ہمت کی اور پان کی تھالی لیکر سب سے پہلے

اسی ہنسی کے بت کی طرف بڑھی۔ اور جھکی —— مگر وہ خدا جانے کس خیال میں گردن جھکائے ہوئے غرق تھا۔ اُس نے نہ مجھے دیکھا۔ نہ تھالی کو! —————— مجھے خفیف ہونا پڑا اور دو تین۔ میرے عاشق —————— استہزا کی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تعجب سے دیکھنے لگے۔

اور میں نے مجبور ہو کر اپنے غرور کو بالائے طاق رکھا۔ اور بولی —— "پان ملاحظہ فرمائیے" —— گردن اوپر اٹھی —— اور مختصر جواب ملا۔ "شکریہ! میں پان نہیں کھاتا" —— اب میں کیا کرتی؟ —— کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں اور بھی خفیف ہوئی۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس شخص سے انتقام لوں۔ کچھ کہوں۔ سنوں۔ سخت سے سخت جواب دوں۔ چڑاؤں۔ بناؤں۔ مگر جانتی تھی کہ اس کی خاموشی ان سب ہتھیاروں پر غالب آئیگی خاموش رہ گئی۔ مگر یہ میرا غصہ اور احساسِ خفت چند ساعت کے بعد خود بخود غائب ہو گیا۔ جس پر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے ارادہ ضرور کر لیا کہ آج ان بزرگوار کا نام چلتے وقت ضرور پوچھونگی۔ مگر جب محفل برخواست ہوئی۔ اور میں اس کے قریب گئی۔ اور میں نے جرأت سے کام لیکر پوچھ بھی لیا کہ "جناب کا اسم شریف"؟ تو کچھ بھی جواب نہ ملا اور وہ حسب معمول گردن جھکائے زینے سے نیچے اتر گیا۔ اب تو مجھے اور بھی خفت آمیز غصہ آیا۔ اور میں نے اپنی والدہ سے علیحدہ لیجا کر اس کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے اس کے منہ مت لگو۔ ورنہ بُرا ہو گا۔ اب میرا غصہ نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ جس میں کچھ استعجاب شامل تھا۔

کھانا کھایا گیا۔ اور مجھ کو میرے شریک بستر کے پاس تنہا چھوڑ دیا گیا۔ ان کا نام مسٹر افتخار تھا اور وہ ایک دولتمند باپ کے بیٹے تھے۔ خوبصورت تھے۔ طرحدار تھے۔ رات اچھی گزری۔ اور ان کے عشقیات کے انداز سے میں بہت خوش ہوئی۔ مگر جب صبح کو وہ جانے لگے۔ تو ان کی صورت مجھے بہت ناگوار گزری وہ بھی میری صورت کو با حال ناخواستہ دیکھ رہے تھے۔ اور جلد از جلد مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہ رہے تھے۔ میں نے بھی بعجلت خدا حافظ کہا۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ شب میں وہ اظہار تعشق کے ثبوت میں آغوش کو اتنی مضبوط کیے ہوئے تھے کہ میری پسلیاں چُرمُر ہو ہو جاتی تھیں لیکن چلتے وقت انھوں نے باوجود میری توقع کے گلے ملنا تک پسند نہ کیا۔

مسٹر افتخار کے جانے کے بعد میں نے رات کے واقعات کا جائزہ لیا اور شریک بستر کے متعلق یہ رائے قائم کی:

جھوٹا۔ مکار۔ خود غرض۔ خود فریب۔ ناعاقبت اندیش۔ تنومند۔ دولتمند۔ اور بس!

۱۵/ جنوری ۱۹۳۰ء

تعجب! پانچ بجے شام کو وہی خفیہ پولیس کا آدمی تنہا آیا۔ میں اس وقت غسل کر رہی تھی۔ پھر سنگار میں مشغول ہو گئی وہ بیٹھا رہا اور

اس نے اپنے آنے کی اطلاع نہ کرائی۔ جب میں اچانک ملاقات کے کمرے میں پہنچی۔ تو وہ حسبِ معمول گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ میں قریب پہنچ گئی تو اُس نے گردن اُٹھائی۔ میں نے سلام کیا۔ جس کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کا اسم شریف کیا ہے"؟۔ اُس نے کہا "مجھے عزیز کہتے ہیں"۔ "جناب کا شغل کیا ہے"!۔ "میں خفیہ پولیس میں ملازم ہوں"۔ "میرے یہاں آپ کیوں تشریف لائے ہیں"؟۔ "ابھی بتلاتا ہوں"۔ "جی ہاں بتلائیے"۔ "کیا یہ درست ہے کہ آپ کسی کے مکان پر تشریف نہیں لیجاتیں"؟۔ "ہاں! یہ درست ہے۔ لیکن......"۔ "لیکن۔ کچھ نہیں میں ایسے ہی پوچھنا چاہتا تھا"۔ "مگر کیوں!"۔ "یونہی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد کہا"۔ "کیا نتیجہ نکلا"؟ "یہی کہ عجیب بات ہے"۔ "اور کچھ نہیں"؟۔ "ہاں! یہ بھی کہ بڑی مغرور ہو"۔ میں نے فوراً کہا۔ "مگر آپ سے کم"!۔ "اچھا تو میں اب جاتا ہوں"۔ میں نے تعجب میں آکر کہا۔ "اور بغیر اجازت"؟۔ "مغروروں کو اجازت کی ضرورت"؟۔ وہ اٹھا۔ میں اٹھی۔ میں نے تسلیم اس وقت کی جبکہ وہ زینہ میں داخل ہو چکا تھا۔

عجیب آدمی! عجیب باتیں! کیا منشاء تھا اس شخص کا؟ سوال بے محل! جواب بے تکے! خفیہ پولیس کا آدمی! خیر۔

شام ہوئی — یاران شب الوؤں کی طرح جمع ہو گئے اور ایک چڑیا کے جال میں پھنسنے کے لیے!! کمبختوں کے چنگل بیکار۔ بازو بیکار۔ چونچ بیکار — زیادہ کھانا اور خود کو دوسروں کی غذا بنانا ان کا شبینہ شغلہ ہے — ناچ گانا شروع ہوا — اور ختم ہو گیا مسٹر اشرف آج ہمارے تھمی تھے — چوڑے چپٹے — بھدے — مگر غضب کے لسان — ظلم یہ کہ اپنے کو مردانہ حسن کا واحد مالک تصور کرتے تھے — بھلا ان کمبخت مردوں میں حسن کہاں! — حسن تو مخصوص ہے محض نزاکت۔ نسائیت — خاموشی تلون اور تنوع کے لیے — مگر یہ اجارہ دار حسن بنے بیٹھے ہیں اور پھر غضب یہ ہے کہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہر عورت کا ان پر عاشق ہونا یقینی ہے — ضروری ہے — ورنہ ان کی توہین ہے۔ بہت اچھا! میں تو فوراً اس قسم کے مردوں پر عاشق ہو جاتی ہوں اور نہ ہوں تو کام کیسے بنے — یوں بھی ہر طوائف ہر عشقباز پر عاشق ہونے کے لیے مجبور ہے — اور شاید مردوں کے مغالطے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ کہ جہاں پہنچے وہیں ایک نازنین ان پر عاشق! ان کے اظہار عشق سے پہلے وہ اپنی حرکات سے مائل ہونے کا ثبوت دیتی ہے —

ممکن ہے اس قسم کے لوگ شریف عورتوں سے اپنا عشق محض اس لیے واپس لے لیتے ہوں کہ وہ پہلے سے ان پر عاشق نہیں ہوتیں — ہمارا بالاخانہ بھی ان عیاشوں کی ذہنیت کے لیے تربیت گاہ ہے

نفسیات کے مسلمات کے خلاف اگر کوئی تربیت گاہ ہو سکتی ہے تو وہ ہمارا بالاخانہ! صحیح ذہنیت اور درست فطرت کو اگر کوئی معلم بدل سکتا ہے تو وہ محض طوائف ہے۔ سب سے بڑی قوت یعنی عقل۔ سب سے بڑے جذبات یعنی محبت حمیت غیرت کا خاتمہ اگر کسی درسگاہ میں ہو سکتا ہے تو وہ ہمارا مکتب ہے۔ ہر طالب علم انتہائی ذہن و ذکاوت لیکر آتا ہے مگر بیوقوف اور اتو بنکر جاتا ہے۔ ہر طالب علم محبت اور حمیت کے صحیح جذبات کی چنگاریاں لیکر آتا ہے۔ مگر قلیل عرصہ ہی میں راکھ اور خاک جھولی میں ڈالی کر لیجاتا ہے لیکن چالاکی۔ مکاری۔ اور شاطری کے فنون رذیلہ میں کاوشتگاہ حاصل کر کے جاتا ہے ؎

گو عاشقی میں لٹ گئے بدنام بھی ہوئے
ہارے طبیعتوں کے نو چالاک ہو گئے

بہرکیف۔ مسٹر آشرف پر مجھ کو عاشق ہونا پڑا۔ کیونکہ والدہ کا حکم ایسا ہی تھا۔ اور اب مجھ کو عشق لڑانے، اپنی اور اپنے عشاق کی فہم و فراست کو ٹکرانے اُن کی طرح سچ کو چھپانے جھوٹ کو حقیقت کے پردے میں نمایاں کرنے میں بڑا مزہ آنے لگا تھا۔ میں مسٹر آشرف کو تخلیہ میں لے گئی اور دو تین منٹ کے اندر میں نے ان کو اپنے عشق کا یقین دلایا۔ اور پھر اپنی ضرورت اور غریبی کا اظہار بھی ایسے انداز میں کیا کہ وہ جواب میں محض نوٹوں سے بھرے ہوئے بٹوے کو نکالنے پر مجبور ہو گئے۔ گویا یہ ان کی حقیقی محبت کا ثبوت تھا۔ میں نے بٹوا لیا۔ کھولا۔ نوٹ گنے۔ اور منہ بنا کر کہا "ان سے کیا ہوتا ہے" میری صورت تو ان سے

دس گنی رقم کی محتاج ہو"۔ میں نے بڑا جھٹک دیا۔ جو مجھے زبردستی واپس دیا گیا۔۔۔ اور بڑی بڑی قسمیں کھائی گئیں۔۔ مزید رقم دینے کے وعدے کیے گئے۔ میں ٹھنک کر آغوش سے جدا ہو گئی اور کمرے سے باہر آ گئی۔ مگر بٹوہ کو نہ بھول سکی اس کو بھی اپنے ساتھ لائی۔۔ مسٹر اشرف بھی باہر آئے۔ میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔"جب تک میری فرمائش پوری نہ ہوگی میں آپ سے بات نہ کرونگی"۔۔۔ یہ کہکر میں اپنی والدہ کے کمرے میں چلی گئی وہ بھی وہیں آن دھمکے۔ والدہ سے شکوہ شکایت کی جنھوں نے جواب دیا۔۔"وہ جانے آپ جانیں بھلا میں کیا جانوں"۔

آدھے گھنٹے کے بعد یہ حضرت بصد حسرت ویاس روانہ ہو گئے اور میں چین سے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔۔۔ مگر سونے سے پہلے اُس خفیہ پولیس کے متعلق کافی دیر تک سوچتی رہی۔ کیا مطلب تھا بیچارے کا اُس سوال سے!

۲۱/جنوری ۱۹۳۰ء

گذشتہ ہفتہ میں سب آتے اور جاتے رہے مگر وہ خاموش انسان نہ آیا اور میں نے یہ خیال قائم کر لیا کہ وہ غریب ہے شریف د

اور مجھے پسند نہیں کرتا اس لئے اب کبھی نہ آئیگا۔ چھ بجے کے قریب کچھ لوگ آئے۔ اتفاق سے میں گلنے کے کمرے میں ہی سو رہی تھی۔ ایک نرم قالین پر لیٹی تھی اور ایک اونی شال مجھے چھپائے ہوئے تھا۔ میری والدہ جاگ رہی تھی آنے والوں کی آہٹ اور گفتگو سے میری نیند اُچٹ گئی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ سونے کی کوشش کی۔ منہ نہ کھولا۔ مگر سو نہ سکی ان کو بھی ڈانٹ نہ سکی ۔۔۔ طوائف حسن کی ملکہ ہونے کے باوجود بدترین غلام ہے۔ جس کا مالک ہر ادنیٰ و اعلیٰ انسان ہے۔ یہ ان پر ظلم و ستم محض ہر وقت کر سکتی ہے مگر وہ ہر وقت استقبال اور خوش آمدید کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ گو بظاہر حکم چلاتی ہے مگر ان کی محکوم ہے اُن کی اطاعت اپنی مرضی کرنے پر مجبور ہے۔ اُن کی مداخلت بیجا پر وہ لب تک نہیں ہلا سکتی یہ سب شائد اس لیے ہے کہ اس کے سب عاشق ہیں۔ مگر اس کا کوئی "مرد" نہیں۔ عورت بغیر ایک "مرد" کے عضو معطل اور لاچار محض ہے۔ میری والدہ نے پان لگائے پیش کیے۔ دو آدمیوں نے کھا لیے۔ مگر تیسرے شخص نے انکار کر دیا۔ مجھے فوراً خاموش انسان یاد آیا۔ مگر میں نے اب بھی چہرہ نہ کھولا والدہ نے مجھے جگایا۔ اور کہا۔ "لیلیٰ دیکھو آپ کو پان کھلاؤ۔ انھوں نے میرے ہاتھ سے پان نہیں کھایا" میرے سر کے بال کھلے ہوئے تھے اور جسم کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اور چونکہ چہرہ پر بھی بڑے ... ے تھے۔ میں ان لوگوں کو نہ دیکھ سکتی تھی لیکن والدہ کے ان جملوں نے ... مجھے ... بتایا۔ اور میں نے بال ہٹا کر ان لوگوں کو دیکھا۔

ایک صاحب بڑے فربہ تنومند۔ طاقتور خوبصورت بڑی بڑی مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے انسان تھے جو میری والدہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے میں فوراً پہچان گئی کہ وہ میرے شکار نہیں بلکہ ان کے شکار یا شکاری ہیں۔ دوسرے صاحب بہت نوعمر دبلے پتلے لانبے اور سوٹ پہنے ہوئے تھے مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ کمرے کو بے نیازانہ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے میں نے بھانپ لیا کہ ان کو شکار سے کوئی دلچسپی نہیں محض شکاریوں کے ساتھی ہیں۔ تیسرے صاحب چھریرے بدن کے نوجوان میانہ قد۔ کالا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اپنے کو لیے دیئے بیٹھے تھے ان کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں بے حد خوبصورت تھیں۔ چہرے سے ذہانت برس رہی تھی جس سے میں کافی متاثر ہوئی۔ یہ وہی صاحب تھے جنھوں نے پان نہیں کھایا تھا۔ میں نے تھالی کو اٹھایا اور ان کے سامنے پیش کیا۔ مگر انھوں نے پھر انکار کر دیا اور تھالی میں ایک نوٹ ڈال دیا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا"۔ انھوں نے کہا "آپ کے حسن کا نذرانہ" میں نے کہا۔ "کیا میں خوبصورت ہوں"؟ وہ بولے۔ "جی ہاں لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں" میں نے پوچھا۔ "اور آپ کیا کہتے ہیں"؟ فوراً بولے۔ "وہی جو میں کہتا ہوں" عجیب جواب تھا۔ عجیب طبیعت کے انسان تھے۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ پہلے صاحب سردار صاحب تھے دوسرے مرزا صاحب تیسرے میر صاحب۔ تینوں عجیب اور نرالے رنگ کے انسان تھے مگر بیحد دلچسپ تھے۔ ظریف، نفیس، جدت پسند۔ اور خوش باش! یہ تین انسانوں کی پہلی ٹولی تھی جس سے میں

بیحد خوش ہوئی
میر صاحب کے برابر ایک بڑا آئینہ دیوار سے لگا رکھا تھا جس کو انھوں نے دیکھ لیا کہ یہ آئینہ ہے۔ فرمایا ــــ "لیلیٰ! کیا میں اس کا سہارا لے سکتا ہوں" ــــ میں اس معنی خیز جملہ پر پھڑک گئی اور فوراً کہا "جی ہاں! مگر اس کا خیال رہے کہ شیشۂ دل ہے چور چور نہ ہو جائے"
سردار صاحب۔ اور مرزا صاحب میرے اس جواب پر عش عش کرنے لگے مگر میر صاحب نے میرے جواب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "چونکہ آپ کا رخ زیبا اس آئینہ میں بند رہتا ہے اس لیے اس پر تکیہ کرنا چاہتا تھا" ــــ میں نے مسرور ہو کر معاً کہا ــــ "مگر وہ آئینہ بند نہیں ہے" ــــ وہ بولے ــــ "شاید منہ پھٹ ہے"! اس جملہ سے میں خفیف ہو گئی اور سردار صاحب بولے۔ "ہاں! تو میر صاحب آپ یہ نہ لیجئے تاکہ آپ کسی کے منہ لگنا چاہتے تھے۔ آئینہ کا تو بہانہ تھا" ــــ مرزا صاحب فوراً بولے۔ "منہ لگنا چاہتے تھے۔ جبھی تو منہ کی کھائی" ــــ اس پر سب نے قہقہہ لگایا اور میں بھی ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ میر صاحب بولے۔ مرزا صاحب! آپ آجکل ذرا منہ زور ہوتے جا رہے ہیں" ــــ سردار صاحب نے اضافہ کیا۔ جی ہاں لگام ذرا ڈھیلی ہے" ــــ میں نے کہیں کہدیا۔ آپ لوگ مرزا صاحب کا منہ بند کرنا چاہتے ہیں ــــ میر صاحب ترق کر بولے ــــ "جی ہاں آپ کے یہاں آئینہ بندی تو نہیں ہوتی۔ مگر حد بندی۔ لب بندی۔ نظر بندی اور ہندی کی چندی ضرور ہوتی ہے" ــــ

سردار صاحب ———— "بھائی واہ! مگر۔ ماتھے کی بندی بھول گئے"۔ اس پر جو قہقہہ لگا ہے تو عام کمرہ گونج اٹھا۔ اور پھر سردار صاحب اور میر صاحب کے قہقہے تو دیوار شکن قہقہے تھے۔ کئی منٹ تک ہنسی جاری رہی اور میں بیحد محظوظ ہوئی ———— ہنسی ختم ہونے کے بعد مرزا صاحب نے کہا کہ ہمارے میر صاحب بغیر چونا لگا پان کھاتے ہیں۔ ذرا لگا دیجئے۔ میں نے اس جملے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فقرہ چسپاں کیا اور سمجھی کہ اب میر صاحب مات کھا جائینگے۔ "تو کیا میر صاحب۔ واقعی چونا نہ لگاؤں"؟ مگر کسقدر غضب کا برجستہ جواب میر صاحب نے دیا کہ خدا کی پناہ! میں عرق عرق ہوگئی۔ فرمایا "اگر لگاؤ گی تو منہ کٹ جائیگا۔ اور تھوکنا پڑے گا"۔ میں چپ ہوگئی۔ پان دان کھینچا۔ پان پر کتھا لگانے لگی۔ اچک کر میر صاحب پاس آکے پان لے لیا۔ خود کتھا لگایا اور منہ میں رکھ لیا میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مجھ پر عمر میں پہلی مرتبہ اس حرکت کا رعب پڑا۔ یا یوں کہونگی کہ میں پہلی بار کسی شخص کے مردانہ قرب سے مرعوب ہوئی ———— وہ پھر اپنی جگہ چلے گئے۔ اجازت طلب کی شب میں آنے اور گانا سننے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

گانا ہو رہا تھا۔ شب کے دس بج چکے تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی آج وہ خاموش انسان بھی کونہ میں موجود تھا۔ جس کو میں اور روز سے زیادہ مضمحل پا رہی تھی۔ اُچٹتی ہوئی نظریں ڈال کر معلوم کرنے کی

کوشش کر رہی تھی۔ اور تانیں بھی لے رہی تھی کہ اتنے میں یہ خوش باش ٹولی نمودار ہوئی جس کو دیکھتے ہی میں خلاف معمول کھڑی ہو گئی۔ اور تسلیم بجا لائی۔ میری اس حرکت پر سب چونکے چند کے منہ چڑھ گئے۔ میر صاحب نے آتے ہی ایک یہ غضب کیا کہ مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے شرما شرمی ہاتھ بڑھایا تو اتنے غضب کا جھٹکا دیا کہ میں "اوئی" کر کے رہ گئی۔ اور سردار صاحب اور مرزا صاحب نے واد قہقہہ لگایا کہ کئی اور لوگ بھی قہقہوں میں شریک ہونے کے لیے مجبور ہو گئے۔ میں بھی کھسیانی ہو کر ہنسنے لگی۔۔۔۔ میرے ہاتھ کو اس سے پہلے کبھی کسی نے اتنے زور سے جھٹکا نہ دیا تھا۔ میرے تیور پر بل آیا۔ مگر دل کی اندرونی مسرت کے احساس نے تیور کے بل کو تیکھے چتون میں تبدیل کر دیا۔ اور میں سکڑ کر پیچھے ہٹکر ان کی طرف دیکھکر اور مسکرا کر رہ گئی اور بیٹھ گئی۔ میر صاحب کی ہر حرکت میرے لیے جاذب تھی۔ حالانکہ میں ان سے ابھی تک بے تکلف نہ ہونے پائی تھی اور رواجاً ان کو اقدام ناروا تھا۔ مگر ان کا کردار اسقدر مردانہ تھا کہ وہ نسائیت کو محکوم و مرعوب کرنے والے تمام صفات سے بدرجہ تم متصف تھے۔

خاموش انسان نے ان خوش باش دوستوں کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا نہ بولا نہ ہنسا۔ مگر مصافحہ ہر ایک سے کیا اور پھر بیٹھ گیا۔۔ میں نے ایک غزل شروع کی۔ مطلع نہ گا سکی تھی کہ میر صاحب نے روک دیا۔ اور دیس گانے کی فرمائش کی۔ میں نورا بھی۔ اور پھر ایک چیز دیس کی

شروع کی۔ سماں بندھ گیا۔ اس پارٹی نے وہ برمحل داد دی کہ میں بے انتہا جوش وخروش کے ساتھ تمام حزنیہ جذبات اور والہانہ کیفیات کیساتھ گانے لگی ——— مجھے خود احساس ہوا۔ اور یہ پہلا احساس تھا کہ میں نے اس سے اچھا کبھی پہلے نہیں گایا اور گانے میں اس سے زیادہ لطف کبھی نہیں آیا۔ لوگوں نے روپیہ ہاتھوں میں لیا میں نے لینا اور انھوں نے دینا چاہا۔ مگر میر صاحب نے اُن کو اور مجھ کو سب کو منع کردیا۔ اور یہ کہا کہ گانے کا مزہ مت خراب کیجئے ——— میری والدہ اور خالہ اور سازندوں کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ مگر غضب کی شخصیت کا مالک تھا۔ یہ میر صاحب! کہ کوئی کچھ نہ کہہ سکا ——— مجھے ہاں! ایک طوائف کو اس کی یہ حرکت بھی مردانہ معلوم ہوئی۔ اور بہت پسند آئی۔ اور میں نے زیادہ محنت، ہنر اور ریاضت کے ساتھ گانا شروع کردیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس خاموش انسان نے بھی دبے لفظوں میں داد دینا شروع کردی۔ جسکی میں نے سچے دل سے قدر کی اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شخص سخن فہم اور ہنر شناس ضرور ہے۔ گانے میں باوجود جنوری کا زمانہ ہونیکے مجھے پسینہ آگیا۔ مگر طبیعت اور زوروں پر ہوگئی۔ سب لوگ خاموش تھے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بعض پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ داد دیتے وقت اگر کسی کی زیادہ آواز نکلتی تھی تو وہ میر صاحب تھے باقی سب اشاروں سے گردن ہلاکر۔ ہاتھ نچاکر داد دے رہے تھے اور آہیں بھر رہے تھے ——— موسیقی کے جادو ہونے کا یقین کچھ کچھ مجھے آج ہو رہا تھا!

گانا ختم ہوا۔ اور میر صاحب نے ایک بھاری رقم میری والدہ کے سامنے پھینکدی۔ جس کو دیکھ کر وہ خوش ہوگئیں اور دعائیں دینے لگیں ——— یہ خوش باش پارٹی اس خاموش انسان کو چلتے وقت اپنے ساتھ لیگئی ——— کاش وہ کچھ دیر ٹھہر جاتا! ———

یکم فروری سنہ ۱۹۳ء

گذشتہ ہفتہ میں حسب معمول گانا ہوتا رہا اور لوگ سنتے رہے۔ اہل غرض آتے رہے۔ جاتے رہے۔ خوش باش ٹولی بھی آتی رہی اور میرا دل بہلاتی رہی۔ مگر وہ خاموش انسان ہفتہ بھر غائب رہا اس نے اپنا نام عزیز بتایا تھا۔ آج میں بہت خوش تھی۔ اور دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہ ٹولی اور عزیز ضرور آئے۔ میں اچھا گانا چاہتی تھی اور بغیر ان لوگوں کی موجودگی کے میں نہ اچھا گا سکتی تھی نہ ناچ سکتی تھی۔ اور نہ ہی زیادہ دیر تک خوش رہ سکتی تھی ———

خوش نصیبی سے خوش باش ٹولی دس بجے آئی اور میری جان میں جان آگئی۔ عزیز صاحب ساڑھے گیارہ بجے آئے اور حسب معمول بغیر علیک سلیک کونہ میں خاموش بیٹھ گئے۔ خدا جانے بات کیا تھی کہ لوگ اُن سے واقف نہ تھے۔ خوش باش پارٹی البتہ کچھ واقف معلوم ہوتی تھی۔ مگر

وہ بھی اس سے زیادہ بات چیت نہ کرتے تھے۔ غزلیں گانا بند ہوئیں اور میر صاحب نے راگ راگنی شروع کرائی۔ میں نے ان کی وجہ سے گذشتہ ہفتہ میں تین چار راگنیاں نئی یاد کی تھیں۔ شوق سے سنانا شروع کیں۔ تماش بینوں کی اس مجلس میں آج ایک نئے شخص کا اضافہ تھا۔ جو مٹھی بھر بھر روپیہ دے رہا تھا۔ اس کا نام بُدھن پہلوان تھا۔ دیو کا بچہ۔ قوی ہیکل مہیب صورت۔ سیاہ فام انتہائی بدصورت اور جنگلی آدمی تھا۔ میر صاحب نے جوش میں آکر اس پہلوان کے مقابلہ پر ایک دس روپیہ کا نوٹ دیدیا۔ اب کیا تھا۔ پہلوان صاحب کے آگ لگ گئی۔ اور اب انھوں نے بجائے روپیوں کے نوٹ دینا شروع کر دے۔ جس کا اثر میرے گھر والوں پر اور خصوصاً والدہ پر بہت ہوا۔ میر صاحب نے جب دو تین نوٹ اور دیئے تو میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کر دیا کہ وہ اب نہ دیں۔ مگر وہ عجب صاف گو تھے انھوں نے اشاروں میں بتلا بھی دیا کہ اب اُن کے پاس روپیہ ہے ہی نہیں ——— لیکن بدھن پہلوان جوش سبقت میں دیتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ہر شخص نے روپیہ دینا بند کر دیا۔ وہ بار بار اپنی لانبی مونچھوں کو تاؤ دیتا جاتا تھا۔ سینہ نکال نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا اور اکڑتا جاتا تھا۔ یہاں یہ لکھ دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بدھن پہلوان یہ سب روپیہ اپنا مکان بیچ کر لایا تھا۔ اور وہ میرے مکان پر یہ روپیہ اس لیے خرچ کر رہا تھا کہ میرے برابر میں رہنے والی طوائف جس سے اس کا تعلق تھا۔ اور کسی بات پر

حال میں ہی دونوں میں ان بن ہو گئی تھی۔ معلوم کرے اور خوب جلے۔ اُس طوائف کا نام لالی تھا اور اُس نے مجھے یہ کُتب واقعات منہ بسور بسور کر سنائے تھے ____ خیر! یہ تو معترضہ جملے تھے۔ مگر لکھنا مجھے آج کی ڈائری میں یہ ہے کہ بدھن پہلوان اٹھا اور میری والدہ کو باہر صحن میں لے گیا۔ کچھ گفتگو کی۔ اور پھر آن بیٹھا بارہ بج گئے اور لوگ جانے لگے۔ خوش باش جماعت نے جب بھی اُٹھنا چاہا میں نے منع کر دیا۔ اور مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ میر صاحب جیسی ہستی نے میری خواہش کو رد نہ کیا۔ کچھ دیر بعد سب چلے گئے۔ اور محض میر صاحب سردار صاحب۔ مرزا صاحب اور بدھن پہلوان رہ گئے۔ اب میر صاحب کو جانے کی بےچینی پھر پیدا ہوئی وہ اُٹھے اور ان کے ساتھ دونوں دوست بھی فوراً کھڑے ہو گئے۔ میر صاحب نے اجازت طلب کی۔ میں خدا جانے کیوں گھبرا گئی۔ میں اُن کی بےرُخی سے واقف تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر ایک سانس لیا۔ اور خدا جانے کیوں کہہ دیا کہ آپ نہیں جا سکتے مجھے آپ سے ایک بڑا ضروری کام ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے ان جملوں کا اچھا اثر ہوا اور وہ سب پھر بیٹھ گئے مگر بیٹھتے ہی میر صاحب نے فوراً پوچھا کہ جلد بتلائیے کیا کام ہے۔ میں نے سٹ پٹا کر کہا کہ آپ کو میرے ساتھ کھانا کھانا ہے اور ضرور کھانا ہے۔ اگر آپ نے انکار کیا تو مجھے سخت ملال ہوگا۔ یہ کہکر میں نے اپنی آنکھوں کی پوری کشش کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ سکتی تھی۔ انھوں نے

میری بات کو مان ضرور لیا۔ مگر ان کے چہرے پر ایک اختشار کی کیفیت تھی جس کو میں نہ سمجھ سکی

_____ کھانا شروع ہوا کم ہوگیا۔ بازار سے منگایا گیا اور سیر ہو کر کھایا گیا۔ مگر میری خواہش کے خلاف بُدھن پہلوان اس کھانے میں شریک رہا۔ کھانا کھا کر بدھن ڈکاریں لیتا ہوا۔ میرے سونے کے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ اور اب میرے کلیجے پر بجلی گر پڑی کیونکہ میں نوعیت معاملہ سمجھ گئی سردار صاحب۔ جو بڑے جہاندیدہ تھے اِدھر اُدھر اور میری طرف دیکھنے لگے۔ اور بولے۔ "کیوں لیلیٰ کیا ہمیں اب زیادہ ٹھہرا کر ہماری توہین کرانی مقصود ہے"؟ میں سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دوں۔ میر صاحب نے فرمایا۔" میں سمجھ نہیں سکا کہ تمہارا مطلب کیا ہے"؟ _____ اس جملہ کو سنکر مجھے اپنے اوپر رحم آیا اور پھر افسوس ہوا _____ اندرونی خیالات میں غلطاں پیچاں تھی کہ ان کے نوعمر دوست مرزا صاحب نے میرے خیالات کی کچھ ترجمانی کی اور بولے "میر صاحب میرا خیال ہے کہ لیلیٰ آپ سے کچھ تخلیہ میں کہنا چاہتی ہے"۔ میر صاحب نے کہا۔ "اچھا" وہ کھڑے ہو گئے۔ میں کھڑی ہو گئی کہنا چاہتی تھی۔ مگر نہ کہہ سکی _____ اور مجھے خوشی آمیز احساس ہوا کہ مجھ میں جذبۂ حیا ابھی تک موجود ہے _____ سردار صاحب مخل ہوئے اور بولے۔ دیکھو لیلیٰ! ہم بیحد بے تکلف دوست ہیں اور ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے۔ لہٰذا جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو اور دیر مت کرو"۔ میر صاحب نے اور مرزا صاحب نے تائید بھی کر دی۔ اب میں کھوئی گئی۔

کہتی تو کیا کہتی اور کیسے کہتی! متمنی تھی کہ یہ خود ہی سمجھ جائیں۔ مگر وہ سمجھے سمجھتے تو کیسے سمجھتے! بات ہی نئی تھی! جذبات ہی انوکھے تھے۔ نوعیت ہی عجیب تھی ——— میں نے سوچکر ایک اشارہ دیا "میں چاہتی یہ ہوں کہ آپ تینوں صاحبان آج یہیں آرام فرمائیں" میرے اس جملہ نے ان سب کو حیران بنا دیا اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے سردار صاحب بڑے منہ پھٹ تھے ہنسکر گویا ہوئے۔ لیلیٰ! بڑی ہوشیار ہو! — یعنی میں آپ کا باپ بنوں اور میر صاحب دولھا بنیں اور ہمارے مرزا صاحب"؟ یہ کہکر انھوں نے مرزا صاحب کی طرف دیکھا۔ جو کچھ شرما گئے تھے۔ پھر خود ہی سردار صاحب بولے۔ "ہاں مرزا صاحب خالو بنجائیں" ——— دونوں دوستوں نے ہنسکر مرزا صاحب کی طرف دیکھا جو اپنی معصومیت کے ساتھ مسکرا دیئے اور بولے "نہیں۔ سردار صاحب میں خالو والو بننے کے لیے تیار نہیں ہوں البتہ اگر میر صاحب گوارا فرمائیں تو بھائی بن سکتا ہوں۔" اس جملہ سے مجھے اتنی مسرت ہوئی۔ مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے بڑھکر مرزا صاحب کو اپنے بازو سے لگا لیا۔ اور مرزا صاحب بھی انتہائی شریف جذبات کے ساتھ مسکرا کر میرے پہلو سے ذراہٹ کر کھڑے ہوگئے

کتنے اچھے تھے یہ تینوں دوست! بیحد شریف۔ بیحد پیارے اور ایک دوسرے سے بھی وہ قابلِ ستائش۔ محبت کرتے تھے اور

بیحد مخلص تھے۔

مرزا صاحب نے بڑھ کر میر صاحب کا ہاتھ پکڑا اور کھینچکر میرے اور اپنے سامنے کھڑا کر لیا اس حرکت سے میں اتنا خوش ہوئی کہ جی میں آیا پیارے مرزا کا منہ چوم لوں۔ لیکن بوجہ حیا نہ کر سکی۔ اب میر صاحب کا سامنا تھا جو مجھے دل کے اندر پیوست ہونے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور میرے جذبات کا جائزہ لے رہے تھے میں نے بے انتہا کوشش کی کہ اُن کی انکھوں سے آنکھیں ملاؤں۔ مگر نہ ملا سکی۔ میں نے ہمت کرنا چاہی کہ اُن کی انکھوں میں آنکھیں ڈالدوں۔ میں نے چاہا کہ میں خود کو ان کے سپرد کردوں! میں نے چاہا کہ میں ان کے مردانہ شانے کو اپنے آنسوؤں سے ترکردوں۔ میں نے چاہا کہ میں ان کی گود میں بلک بلک کر روؤں اور وہ کہدوں جو میں ان سے کہنا چاہتی ہوں!۔ مگر کچھ نہ کر سکی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ مرزا۔ پیارے مرزا نے اسوقت بڑا غضب کیا میرا ہاتھ اپنے معصوم ہاتھ میں پکڑا اور اس کو میر صاحب کی طرف بڑھا دیا اور کئی سکنڈ تک بڑھائے رکھا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں اپنے ہاتھ کو بحیثیت ایک طائف کے۔ بحیثیت ایک عورت کے کھینچ لیتی۔ مگر نہ کھینچ سکی۔ دل چاہتا تھا کہ کوئی اس کو بطور بہانہ پکڑے رہے اور میں اس کو اسوقت تک کھینچوں جب تک کہ ــــ اُن کے ــــ ہاتھ ــــ اُن کے مردانہ ہاتھ۔ اس کو پکڑ کر۔ اپنے بھاری سانس سے آشنا کراتے ہوئے اپنے خوبصورت اور گرم ہونٹوں سے مس نہ کردیں۔ مگر میری یہ آرزو۔ افسوس!۔

پوری نہ ہو سکی ـــــ اور وہ ہوا جس کی میں متوقع نہ تھی۔ جس کی میں متحمل نہ ہو سکی۔ مرزا نے میرے ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ جو سہارا دیا تھا توڑ دیا۔ اور میں بھونچکی ہو کر مرزا کی طرف دیکھنے لگی۔ جو بیحد حیرت کے ساتھ میر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے معاً میر صاحب کی طرف رُخ کیا پہلے ان کے قدموں کو دیکھا۔ پھر سینہ کو دیکھا اور پھر چہرے پر نظر ڈالی قیامت ـــــ قیامت۔ تھی جب میں نے ایک بیش بہا آنسو میر صاحب کی محبت بھری آنکھوں میں دیکھا۔ جس کو وہ پینے اور دبانے کی کوشش اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ میں کانپنے لگی۔ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میری والدہ کی منحوس صورت خیال میں مجھے ڈرانے لگی۔ لیکن اس خوف پر میں نے بسرعت تمام قبضہ پا لیا اور پھر اُس آنسو کو دیکھنے لگی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس ایک آنسو پر اپنی ناپاک ہستی کو ہمیشہ کے لیئے قربان کرنے سے پہلے اس مجسمہ کا طواف کروں پھر پوجا کروں۔ پھر دل کی وہ بات کہوں جو آج تک کسی سے نہیں کہہ سکی۔۔ اور پھر خوشی خوشی جان دے دوں ـــــــــــ

سردار صاحب۔ اور مرزا صاحب ـــــ کتنے عقلمند اور اچھے ہیں یہ دونوں۔ ـــــ ہنکر میرے پیچھے چلے گئے اور میں آزادی کے ساتھ اپنے دیوتا کو دیکھنے لگی ـــــ سب کچھ کرنا چاہا ـــــ مگر کچھ بھی نہ کر سکی ـــــ عجیب بے بسی تھی۔ عجیب گومگو تھی۔ عجیب کیفیات تھیں۔ کاش یہ نظارہ یہ کیفیات کبھی ختم نہ ہوتیں ـــــــــ مگر........ میر صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے جذبات پر قابو پا کر کہا۔ لیلیٰ! تم

غلطی کر رہی ہو" ———— بجلی بھری تھی لفظوں میں مقناطیسی کشش بھی اس طرزِ گفتار میں ———— میں کھنچی اور چشم زدن میں ۔ میں نے اپنا سر ان ڈھڑکتے ہوئے دل والے مردانہ سینہ پر رکھ دیا ۔ میں نے چاہا کہ اپنے ہاتھ کو ان کی کمر میں حمائل کر دوں ۔ مگر نہ کر سکی ۔ میں چاہتی تھی کہ پہلے وہ اپنے بھاری ہاتھ میرے بازوں پر رکھ دیں اور مجھے تھام لیں ۔ مگر تعجب ! ان کے دل کی دھڑکن اور بڑھ گئی ۔ میں نے صاف محسوس کر لیا کہ ان کا تمام جسم خفیف ارتعاش لیے ہوئے ہے

اللہ رے جذبات ! پیر صاحب سی ہستی ۔ ان کی مردانہ شخصیت آخرش وہ مجھے نہ سنبھال سکے ۔ اور ان کی پہلی لڑکھڑاہٹ پر میں ڈر کے پیچھے ہٹ گئی ۔ اور میں نے وہ کیا جس کی توقع مجھے اُن سے تھی ۔ ان کے بازو پکڑ لیے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی اور وہ سنبھل گئے ۔ ممکن ہے اس سنبھلنے میں اُن کی ذاتی کوششیں بھی شامل ہوں ———— وہ سنبھلے اور بولے ۔ "لیلیٰ ! میں تم سے ڈرتا ہوں" میں نے اس جملے کو سنا اور محسوس کیا کہ مجھ پر دوبارہ بجلی گری ———— کتنے مطالب ہو سکتے ہیں اس جملے کے ؟ ۔ عجیب جملہ تھا ۔ مبہم بھی تھا ۔ پر اسرار جملہ !! میں نے انتہائی نسوانی کمزور لہجہ میں کہا ۔ "کیوں ڈرتے ہیں آپ مجھے" ؟ انھوں نے جواب دیا ۔ "خدا جانے" ۔ میں نے کہا "کیا مطلب آپ کا ڈرنے سے" ؟ وہ بولے ۔ "میں ۔ میرا دل ۔ میرا دماغ

اور شاید میرے دونوں دوست، سب تم سے ڈرتے ہیں" عجیب بات تھی یہ! ۔ بالکل عجیب! سردار صاحب اور مرزا صاحب بھی فوراً بول اٹھے ۔ " ہاں یہ حقیقت ہے ۔ یہی نہیں بلکہ جب سے یہ آپ سے ڈرنے لگے ہیں ۔ ہم دونوں اِن سے بھی بہت ڈرنے لگے ہیں" ! میں نے گھبرا کر پوچھا ۔ "کیوں ہے ایسا ؟ یہ کیا بات ہے" ؟ سردار صاحب اپنے خاص انداز میں بولے ــــ "لیلیٰ ! تم ابھی بہت کم عمر ہو اس کے سمجھنے کے لیئے ! ــ "خدایا یہ کیا معمہ ہے" میں نے اپنے دل سے کہا ــــــــــــــ کچھ دیر چپ رہکر میں نے کچھ سوچا اور پھر کہا ــــ کچھ بھی ہو میں آپ لوگوں کو نہ جانے دوں گی" ۔ سردار صاحب نے متانت کے ساتھ کہا ۔ "لیلیٰ ! ہم تینوں دوستوں کے پاس اس وقت مشکل سے پانچ دس روپیہ جیب میں بچے ہوں گے" ۔ اس جملہ کو سنکر مجھے اپنی ظاہری حالت کا ~~کچھ~~ احساس ہوا ۔ میرزا صاحب بھی اپنی سادگی کے ساتھ بولے ۔ "بیشک یہ ٹھیک ہے میری جیب میں تو کل تین روپیہ ہیں آپ لگ لے سکتے ہیں ۔ مگر میں ٹھہر نہ سکونگا میرا واپس جانا بیحد ضروری ہے" ــــ میر صاحب نے فرمایا ۔ "لیلیٰ ہم پھر کبھی آئیں گے اب خدارا اجازت دیدیجئے ۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ والدہ آئیں اور یہ کہکر چلی گئیں "لیلیٰ ! جاؤ جاؤ پہلوان صاحب تمھارا انتظار کر رہے ہیں" یہ سنکر میں نے زور سے کہا ــــ میں ہرگز نہ جاؤنگی ۔ کون ہوتے ہیں پہلوان صاحب

مجھکو بلانے والے ہیں" اتنا کہنے پائی تھی کہ پہلوان صاحب اینڈتے ہوئے آئے اور انھوں نے گرج کر کہا۔ "میں نے روپیہ صرف کیا ہے میں اپنا وقت خراب نہیں کر سکتا۔ تم کو جلد چلنا ہو گا" ان جملوں کو سنکر میر صاحب نے زینہ کی طرف رُخ کیا اور چلنے لگے۔ میں نے لپک کر ان کا بازو تھاما اور کہا۔ "آپ نہیں جا سکتے!" وہ رک گئے اور اُن کے دوست بھی ٹھہر گئے اب پہلوان صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچا۔ میں نے چھڑانا چاہا۔ اُس نے گرفت سخت کی اور میرے ہاتھ کی کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں میں نے چیخ ماری ہاتھ چھوٹ گیا۔ میری کلائی سے خون بہنے لگا۔ جس کو میر صاحب نے دیکھا۔ میں کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ میر صاحب نے اپنی طاقت سے اس وقت قوی ہیکل پہلوان پر حملہ کر دیا۔ مرزا صاحب بڑے جیدار اور بہادر تھے۔ فوراً پہلوان کو کمر کی جانب سے اپنی گرفت میں لیلیا۔ اور مرزا صاحب اور میر صاحب نے پہلوان کی خوب مرمت کی۔ حتیٰ کہ کھینچکر اس کو باہر چھجے پر لائے اور نیچے ڈھکیل دیا۔ چھجے کے نیچے ٹین کی چھت تھی اور اس کے نیچے حلوائی کی دکان تھی وہ ٹین سے لڑھکتا ہوا نیچے گر گیا۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر کے بعد پہلوان اپنے ساتھ تھانہ دار صاحب اور دو سپاہیوں کو لیکر آیا۔ ہم نے مکان کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ پولیس کی آمد کی خبر یہ تینوں شریف دوست سنکر بہت گھبرا گئے اور میں سب سے زیادہ سراسیمہ ہو گئی۔ مرزا صاحب نے بڑی عقلمندی سے میر صاحب اور مرزا صاحب کو زبردستی کمرے میں بند کر دیا اور زینہ کا دروازہ کھول کر

پولیس اور پہلوان کو اندر بلا لیا۔ واقعات بتائے گئے۔ پولیس نے اپنا رعب جمایا۔ مجھ کو ڈرایا دھمکایا اور تھانہ دار صاحب نے گھور گھور کر دیکھا اور کہا۔ "تم اگر ایسی شریف ہو تو اس کوچہ میں قدم ہی کیوں رکھا ہے" وغیرہ وغیرہ ——————— تھانہ دار صاحب کی آواز کو میر صاحب نے پہچانا وہ ان کے کبھی ہم جماعت رہ چکے تھے۔ سردار صاحب سے کہا۔ دروازہ کھلوایا۔ اور تھانہ دار صاحب کو اندر بلایا۔ خدا جانے کیا گفتگو کی۔ پولیس مع پہلوان چلی گئی ——————— بعد میں معلوم ہوا کہ رات بھر پہلوان صاحب کو حوالات میں بند رکھا گیا اور پولیس نے رجسٹر میں اسکو شراب کے نشہ میں بدمست اور مخدوش درج کر کے ضابطہ کی خانہ پری کی ——————— میری والدہ کو شکار ہاتھ سے چھوٹ جانے کا بڑا افسوس ہوا ———————

———————

رات کے ڈھائی بجے تھے۔ اور ہم سب چہ گنم میں تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ میر صاحب نے اپنا رومال میری کلائی پر باندھنے کے لیے نکالا اور میری طرف معنی خیز نگاہ سے دیکھا۔ مرزا صاحب نے پھرتی معاونت بروقت کی اور ہاتھ پکڑ کر میر صاحب کی طرف بڑھا دیا جس کو میر صاحب نے جسم کی پھریری کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ خون کو دیکھا۔ آثار ترحم چہرہ پر ہویدا ہوگئے جن میں صنف نازک کے لیے مردانہ ہمدردی نہاں تھی۔ چوٹ کچھ بھی نہ تھی۔ مگر میں چاہتی

تھی۔ کہ میری کلائی پر وہ پٹی ضرور باندھ دیں۔ کچھ ہچر مچر۔ کچھ حیض بیض کچھ کھچاوٹ کچھ لگاوٹ کے ساتھ میری کلائی پر خوبصورت اور خوشبو سے معطر رومال باندھ دیا گیا جس کے لیے میں نے دلی شکریہ ادا کیا ——
سردار صاحب نے جو عملی آدمی تھے ایک تجویز پیش کی حالانکہ وہ میرے جذبات کے خلاف تھی۔ تاش کھیلنا شروع ہو گیا۔ مجھ کو دانستہ اور بضد میر صاحب کی طرف کیا گیا۔ جس کی وجہ سے میں اور میر صاحب ہمیشہ ہارتے رہے۔ مگر لطف میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی۔ کچھ دیر بعد سردار صاحب نے گانا شروع کیا۔ اچھا گاتے ہیں۔ اب میں نے میر صاحب سے گانے کی درخواست کی ——— انھوں نے کچھ تکلف کے بعد ایسے انداز میں چند چیزیں گائیں کہ میں مسحور ہو گئی۔ میر صاحب کو موسیقی سے خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب گانا نہ جانتے تھے۔ لیکن داد باموقع دیتے تھے۔
اب مجھ سے گانے کے لیے کہا گیا اور میں نے بغیر ساز کے گایا۔ اور مجھے بچپن کا امروہہ میں کبھی کبھی گانا یاد آیا۔ اسی طرح پانچ بج گئے۔ کسی کی آنکھ نہیں جھپکی اور گانے کے کمرے میں بیٹھ کر رات گزار دی گئی۔ یہ پہلی شب تھی جو بغیر گناہ کیے شب بھر جاگ کر کاٹی گئی۔ اور اس میں وہ لذت تھی وہ دلچسپی تھی۔ وہ حقیقی اور روحانی مسرت تھی! جس کو میں عمر بھر کبھی نہ بھولوں گی۔ جب وہ جانے لگے تو میری نسائیت کی شریف رگ بھڑکی اور میں نے آدھ گھنٹہ کی غیر حاضری کی بدقت اجازت لی اور اپنے ہاتھوں سے ناشتہ تیار کر کے پیش کیا۔ جس کو ان تینوں دوستوں اور میں نے بڑے شوق سے کھایا۔ وہ جانے والے تھے۔ آخرش چلے گئے! وہ میرے نہ تھے میں ان کی نہ تھی

وہ رہگذارانِ وادیِ عشرت تھے ۔ میں گلِ افتادہ تھی ۔ یوں ہی چھوڑ دیا گیا ۔ جانے والے چلے گئے ! اور میں عرصہ تک نہ سو سکی ۔ سوچتی رہی ۔ شب کے تمام واقعات آنکھوں میں پھرتے رہے کبھی بیحد خوش ہو جاتی تھی ۔ کبھی خودبخود رنجیدہ ہو جاتی تھی سہم جاتی تھی ۔ ڈر جاتی تھی ——— آخرش اسی حالتِ بیم و رجا میں مجھے نیند آ ہی گئی ۔ اور میں دس بجے دن تک سوتی رہی ———

۱۱ ر فروری سنہ ۱۹۳۰ء

گذشتہ ہفتہ میں میں نے کئی روز گانا نہیں گایا ۔ والدہ سے لڑائی جھگڑا کئی بار ہوا ۔ میرا بستر میری مرضی کے مطابق خالی رہا ۔ اور تنہائیوں میں اپنی پر خطر ۔ دوبھر اور ذلیل زندگی پر غور و تفکر کرتی رہی ۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچی ۔ سب سے زیادہ جس چیز پر میں نے غور کیا وہ یہ جملے تھے ۔ لیلیٰ ! میں تم سے ڈرتا ہوں " ——— " تم غلطی کر رہی ہو " ۔ میں نے ہزار ہا تاویلیں کیں ۔ مگر کسی تصریح سے تشفی نہ ہوئی ۔ لیلیٰ کی خاموش گھڑیوں اور پاک خیال کے الجھنوں سے گھبرا کر میں نے پھر گانا شروع کر دیا ۔ اور کئی راگنیاں میر صاحب کو سنانے کے لیے یاد کیں ——— مگر وہ نہ آئے البتہ خاموش انسان یعنی عزیز صاحب آئے ۔ خاموش بیٹھے ۔ گانا سنا کئے خاموشی سے چلے گئے ۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ ان سے میر صاحب کے

متعلق کچھ پوچھوں۔ مگر نہ پوچھ سکی۔ عزیز صاحب میرے لیے ایک معمہ تھے اور دلچسپی سے خالی نہ تھے۔ لیکن میر صاحب نے مجھ سے سب کچھ فراموش کرا دیا تھا ———

آج کا دن گزرا۔ شام گزری۔ رات آگئی۔ مگر جن لوگوں کو میں چاہتی تھی وہ نہ آئے۔ نہ میں ان کو بلا سکتی تھی نہ خود جا سکتی تھی۔ محض یاد کر سکتی تھی۔ انتظار کر سکتی تھی۔ رنج و غم کر سکتی تھی۔ سو یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ عورت کی بے بسی اور وہ بھی طوائف کی! خدا کی پناہ! اس کے سب ہوتے ہیں اور کوئی نہیں ہوتا۔ گلاب کا خوشنما پھول۔ محبت کی تر و تازگی لیے ہوئے۔ خوشبو سے معطر۔ لہلہاتا ہوا کسی کی محبت بھری انگلیوں کا متمنی کسی کی صحیح قوت شامہ کی تربیت کا خواہاں۔ پھول اُتہیں جا سکتا۔ اگر چاہے بھی۔ تو نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں جہاں کہ وہ جانا چاہتا ہے۔ جوش کے لیے موزوں مقام ہے۔ لیکن ہر کس و ناکس کی بے حس اور بھدی انگلیاں اس کی گردن مروڑ کر توڑ سکتی ہیں۔ اپنے آلائش بھرے ناک کے پاس لیجا سکتی ہیں۔ اور اپنے گندے سانس سے اس کو جھلا سکتی ہیں۔ دو چار گہرے سانسوں کھردری ناک کی رگڑ سے وہ قبل از وقت مرجھا جاتا ہے اور چمنستان رنگ و بو کے بے نیاز اور خوش فکر سیر و تفریح کرنے والے۔ جب چاہتے ہیں اپنی لاپروا انگلیوں سے اس خوبصورت پھول کی خوشنما پنکھڑیاں توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ یہ نوچ لیتے ہیں۔ ڈنٹھل کے اوپر کے مغز کو کچل دیتے ہیں۔ اور ستم دیکھیے کہ کبھی کبھی ایسی حالت یعنی دماغ کا گودا نکالنے کے بعد بھی کہ

پاس بھی لیجاتے ہیں۔ اور جب اُن بھونڈی ناک کو خوشبو کے بجائے کثیف بو آتی ہے تو جھلا جاتے ہیں، ڈنٹھل کو بھی توڑ دیتے ہیں۔ اور اس طرح ریزہ ریزہ کر کے اس خوشنما پھول کو جس کو للچائی ہوئی نظروں سے خوشی خوشی توڑا تھا۔ پھینک دیتے ہیں۔ خاک میں ملا دیتے ہیں غضب تو یہ ہے کہ یہ بیرحم انگلیوں والے اپنے آپ کو حسن پرست آرٹ کا دلدادہ خوشبو کا متوالا اور قدر شناس بھی کہتے ہیں اور دنیا والے تسلیم بھی کر لیتے ہیں ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

لیکن انسان کے بجائے جانوروں کو دیکھئے۔ ایک بھونرا آتا ہے پھول کے چاروں طرف نثار ہوتا ہے۔ بھنبھناتا ہے۔ اُس کے ساز حیات کو ارتعاش ہوتا ہے وہ وجد میں آتا ہے سریلا میٹھا گانا سناتا ہے۔ اس کے متوالے اور مرتعش پنکھوں سے پنکھڑیاں جھومنے لگتی ہیں۔ وہ پھول کا واہاہا منہ چومتا ہے۔ پیار پر پیار کرتا ہے۔ پھر اُڑتا ہے۔ طواف کرتا ہے۔ نثار ہوتا ہے۔ اور پھر عالم بیخودی میں جھومنے لگتا ہے۔ لیکن پھول کی پنکھڑیاں نہیں نوچتا۔ سر نہیں کچلتا نزہت و لطافت کو خاک میں نہیں ملاتا۔ بلکہ اس کو زندگی بخشتا ہے اور باغ میں آزادانہ سانس لینے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

بلبل کو لیجئے۔ وہ آتی ہے پنجے پنکھڑیوں پر نہیں جماتی۔ پھول کی چھاتی پر سوار نہیں ہوتی۔ بلکہ برابر کی ٹہنی پر بیٹھتی ہے چہچہاتی ہے نغمے سناتی ہے۔ پھدکتی ہے۔ اور اپنا ناچ دکھاتی ہے۔ خوشبو کے مزے لیتی ہے۔ مسرور ہوتی ہے۔ اور بغیر کچھ تکلیف دئے ہوئے پھر سے اڑ جاتی ہے۔ بھونرے کو چھوڑئے۔ بلبل کو نظرانداز کیجئے خون چوسنے والی

ڈنک مارنے والی ۔بھدی بدمذاق شہد کی مکھی کو لیجیے ۔ وہ آتی ہے ۔ بھنھناتی ہے ۔ایک ہی سہرا لاتی ہے ۔اپنی غذا حاصل کرتی ہے ۔اور چلی جاتی ہے ۔لیکن پنکھڑیاں نہیں نوچتی ۔گردن نہیں مروڑتی سرچشمہ حیات کو سیل فنا سے آشنا نہیں کرتی ــــــــــــــــــــــــــــــ

حضرت انسان کی ستم ظریفی یہیں ختم نہیں ہوتی ۔بلکہ بعض دفعہ وہ پھولوں کے بجائے غنچوں کو توڑ لیتا ہے ۔حالانکہ جانتا ہے کہ یہ ابھی نہیں چٹکے اور ان میں ابھی خوشبو بھی پیدا نہیں ہوئی لیکن کسی غنچہ ناشگفتہ کو توڑ لیتا ہے ۔ ادھر اُدھر گھما کر دیکھتا ہے اپنی حیوانیت سے بےچین ہو کر اس کو زبردستی کھولتا ہے ۔کچی پنکھڑیاں مسل دیتا ہے ۔تب یہ حماقت کا پتلا اپنی انگلیوں کی محنت کی داد چاہتا ہے اور اس مسلے ہوئے بکھرے ہوئے غنچہ کو ناک کے پاس لیجا کر خوشبو کے لالچ میں گہرا حیوانی سانس لیتا ہے اور وہاں خوشبو کا فقدان پا کر جھنجھلا جاتا ہے اور اس نازک اور نادیدہ غنچہ کو توڑ مروڑ کر پھینکدیتا ہے ــــــــــ لیکن جانور ایسا کبھی نہیں کرتے وہ غنچوں کے پاس نہیں جاتے اور کسی غنچہ سربستہ کو ہوس شامہ کا شکار نہیں بناتے ۔ اشرف المخلوقات انسان ! ــــــــــــــــــــــــــــــ

کاش یہ غنچہ اور پھول باغوں کے بجائے پہاڑوں میں چھپی ہوئی وادیوں میں پیدا ہوا کرتے اور بھونروں اور بلبلوں کے لیے مخصوص ہوتے اور انسانوں کا وہاں گذر محال ہوتا ۔اور اگر باغوں میں پیدا بھی ہوتے تو انسانی نگاہ کو نظر نہ آیا کرتے یا ان کی نظر بد سے بچنے اور چھپنے کی سکت رکھتے اور محض اپنے بھونروں اور بلبلوں کو دکھلائی دیا کرتے !!

شب کے نو بجے تھے میں بادل ناخواستہ گا رہی تھی سامعین اُکتا رہے تھے۔ بعض دفعہ مصرعہ تک بھول جاتی تھی۔ خفیف ہو جاتی تھی۔ اتنے میں زینہ پر ایک خاص قسم کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی اور میں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ یہ قدم میرے سینہ پر پڑ رہے ہیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ اور فوراً ہی میں نے دیکھ لیا کہ یہ آنے والے میر صاحب اور ان کے دوست تھے۔ اپنی مسرت کو یہاں کیسے لکھوں میں غیر معمولی طور پر خوش ہو گئی۔ میرا گانا بند ہو گیا میں سلام تک نہ کر سکی۔ مگر کھڑی ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے چہرے پر اس وقت مبہوت ہونے کے تاثرات موجود ہوں گے۔ جس کو میر صاحب نے اور سب نے دیکھا ہو گا میں نے خود کو سنبھالا اور پھر بیٹھ گئی۔ لیکن مجھے جس بات کا بیحد تعجب ہوا وہ یہ تھی کہ میر صاحب خلاف توقع بیحد خاموش تھے۔ کئی منٹ تک وہ اور میں ایک دوسرے کی مزاج پرسی تک نہ کر سکے۔ میں نے بہانہ تلاش کیا اور پان لگانا شروع کر دئے۔ لیکن بے ارادہ سب سے پہلے پان پر کتھا لگانے لگی اور بجائے چونہ کی چمچی ہاتھ میں لی۔ اور گھبرا گئی۔ چمچی کو چھوڑ کر کسی اندرونی جذبہ سے خوش ہو کر پان کو تہہ کر دیا تھالی میں رکھ دیا۔ اور دوسرے پان بنانے لگی۔ اب سردار صاحب سے نہ رہا گیا اور وہ بول ہی اٹھے۔ "کیوں لیلیٰ! کیا آپ نے چونہ کھانا بالکل چھوڑ دیا ہے"؟ اس جملہ پر فضائے مجلس میں کچھ جان آ گئی۔ اور مجھ میں بھی ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک دوسرے صاحب بھی بول اُٹھے "صاحب! انھوں نے چونہ کیا گانا بولنا۔ ناچنا سب چھوڑ دیا ہے"۔ ایک تیسرے صاحب نے کہا۔

"ارے صاحب! کوئی ہوں گے جو چونہ سے ڈرتے ہوں گے" اب مرزا صاحب بولے۔"جی ہاں! کچھ لوگ یہاں آکر چونہ اور کھانا پسند کرتے ہیں اور کچھ پسند نہیں کرتے"۔ سردار صاحب نے جدت پیدا کی اور کہا۔"لیلی کو اب چونہ کے بجائے نمک چھڑکنا چاہیئے" مرزا صاحب نے فوراً کہا۔" واہ سردار صاحب آپ بھی ماشاءاللہ نمک مرچ خوب لگاتے ہیں۔ اس پر لوگ مسکرائے اور ایک اور صاحب نے کہا۔" مگر صاحب نمک پاشی کے لیے تو دل کے زخموں کی ضرورت ہے"۔ ایک پانچویں صاحب بول اُٹھے نمک پاشی سے پہلے چرکوں کی ضرورت ہے"۔ ایک اور صاحب نے فرمایا۔"چرکہ لیلی لگائیں۔ زخموں پر۔ نمکپاشی لیلی کریں۔ تو کیوں صاحب! آپ کیا کریں؟" میں بیچین تھی کہ میر صاحب آج کیوں نہیں بولتے۔ آخرش وہ گویا ہوئے۔"بس یہی کہ ہم سینہ سپر رہیں اور اُف نہ کریں"! ایک اور صاحب کہ اُٹھے" بڑے ظرف کی بات ہے"۔! میر صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں! اپنا اپنا ظرف ہے"۔ سردار صاحب نے پھر جدت طرازی کی" مگر صاحب سُنا ہے کہ چند ظروف جہاں ہوتے ہیں وہ بجتے ہیں؟ مرزا صاحب بولے" جی ہاں! یہ صحیح ہے وہ ٹکراتے ہیں خوب شور مچاتے ہیں" ایک نئے صاحب نے کہا" غضب کی ٹکریں ہوتی ہیں"۔ سردار صاحب نے پھر بات پیدا کی۔ جی ہاں! یہی ٹکریں ہیں جو ٹھوکریں کھلواتی ہیں"۔ مرزا صاحب نے اضافہ کیا۔" کنوئیں جھنکواتی ہیں۔ بھول گئے"۔ ایک نئے صاحب نے فرمایا۔" اور چکی پسواتی ہیں" سردار صاحب نے پھر غضب کیا اور پھر چونہ کے بجائے جوتے لگواتی ہیں

مرزا صاحب نے پھر لقمہ دیا۔"جی نہیں! پان کے بجائے جوتے کھلواتی ہیں" مرزا صاحب کہاں چوکتے ہیں۔ پھر بات میں بات نکالی۔"جی ہاں! تلّے کی شکل بھی پان کی سی ہوتی ہے۔ اگر بی لیلیٰ! ابھی سے اس پر چونہ کتھا لگا کر پیش کریں .... مرزا صاحب فوراً بولے"جی ہاں کھانے والے خوشی سے کھالیں گے"۔ ایک نئے صاحب نے "گوچندیا کے بال ....؟ اب میر صاحب نے فرمایا "کچھ اڑ جائیں گے کچھ رنگے جائیں گے"۔ اس جملہ پر بزم پھڑک اٹھی۔ اور قریب قریب سب نے داد دی۔ پان کھلانے کے بعد میں نے گانا شروع کیا۔ اور ایسا اچھا گایا کہ پہلے سے بیٹھے ہوئے اصحاب کو تعجب ہوا۔ الغرض کچھ دیر کے بعد گانا ختم ہوا لوگ جانے لگے میں نے میر صاحب کو پھر روکا۔ وہ نہ مانے میں نے پھر سردار صاحب سے سفارش کرائی۔ اور یہ تینوں دوست ٹھہر گئے۔ ہم لوگوں نے ملکر کھانا کھایا۔ خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اس دوران میں ایک بار سردار صاحب اٹھے اور میری والدہ کے پاس کمرے میں گئے: خدا جانے کیا گفتگو کی خوش خوش واپس آئے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں میر صاحب سے کچھ کہا۔ جس کا ظاہری اثر میر صاحب پر یہ ہوا کہ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں نے کئی سوالات کئے مگر انھوں نے جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرزا صاحب اٹھے اور انگریزی زبان میں اپنے دوستوں سے کچھ کہا اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے مجھے بیحد تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا مگر دونوں دوستوں نے کوئی صحیح جواب نہ دیا۔ اب کچھ دیر کے بعد سردار صاحب اٹھے اور کہنے لگے۔ اچھا لیلیٰ!

اجازت دیجئے" امیر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں حالتِ تذبذب میں تھی۔
میں نے رُک رُک کر کہا۔ اور پیر صاحب" سردار صاحب نے ہنسکر کہا۔
"ان کو آپ کے سپرد کیا جاتا ہے" میں اپنی خوشی کو درج نہیں کر سکتی۔ میں
بیحد خوش ہوئی۔ مگر پیر صاحب فوراً اٹھے اور بولے —— "اچھا مجھے
بھی اجازت دیجئے"! اب میں نے جلدی میں کہا —— "یہ کیا
تماشہ ہے"؟ —— میں یہ کہہ ہی رہی تھی کہ سردار صاحب نے ہمکو خدا حافظ
کہا اور چلنے لگے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ
سردار صاحب بجائے زینہ کی طرف جانے کے میری والدہ کے کمرہ کی طرف
چلے گئے۔ پیر صاحب بدستور کھڑے تھے اور میں ان کے مقابل تھی۔
انھوں نے پھر دہرایا —— "اچھا مجھے بھی اب اجازت" میں نے
کہا "آپ تنہا کہاں جائیں گے"؟ انھوں نے کہا "جہاں سینگ سمائیں گے"۔
میں نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلوں؟ وہ بولے ——
"چل سکوگی"؟ میں نے بعجلت کہا —— "ہاں۔ انشاء اللہ"۔ وہ معاً بولے۔
"ماشاء اللہ! مگر مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر نہیں معلوم ہوتا"۔ میں
اس جملہ سے کچھ چڑ گئی اور بولی —— "اچھا تو آپ آج یہیں
ٹھہر جائیے"۔ انھوں نے پوچھا —— "کیوں"؟ میں نے جواب دیا۔
"یونہی" انھوں نے کہا —— "کیا آج بھی خدانخواستہ آپ کے یہاں مارپیٹ
ہونے والی ہے"۔ میں اس چبھتے ہوئے جملہ سے کٹ کٹ گئی لیکن میں نے
محسوس کیا کہ ان کو مجھ پر رحم آیا اور کہنے لگے۔ "لیلیٰ! معاف کرنا۔
میرا مقصد تمھارے جذبات کو مجروح کرنا نہ تھا"۔ —— میں نے

قدر کی ــــ میں خاموش رہی ــ ــ سوچا ـــــــ اور پھر بولی
خیر آج آپ نہ جا سکیں گے۔ میں آپ کو نہ جانے دوں گی" ۔ وہ بولے۔
"مجھے ٹھہرا کر آپ کیا کریں گی" میں نے کہا ـــ "اچھی اچھی باتیں کرونگی۔
انھوں نے تیز لہجہ میں کہا ـ "میں ایک طوائف کے یہاں نہیں ٹھہر سکتا" ان
جملوں نے مجھ پر بجلی گرادی ـ میں عرق انفعال میں ڈوب گئی ـ اور کچھ نہ
کہہ سکی ـــــ مجھے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ سردار صاحب اُس کمرے
سے ابھی تک نہ لوٹے اور یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ میر صاحب ابھی
اپنی جگہ سے نہ ہلے ۔ میں نے مایوس اور مجبور ہو کر ان کو اجازت دینا ہی
مناسب سمجھا اور کہا ـــ "اچھا آپ تشریف لیجا .... اتنا
سنتے ہی وہ مسکرائے اور چل دئیے ـــــــ زینہ کی طرف نہیں ـــ
بلکہ میرے کمرے کی طرف ! میں نے کھڑے ہو کر جھک کر جھانکا اور وہ
خراماں خراماں میرے کمرے میں داخل ہو گئے ـــــــ اب میں
اپنے جذبات ـــــ اپنے نسوانی جذبات کا خاکہ کھینچنے سے قاصر ہوں
دل دھڑکنے لگا ـ حیا کا پسینہ آگیا ـ خوشی سے چہرہ تمتما گیا فرط مسرت سے
ہاتھ پانوں پھول گئے ـ قلبی سکون سے دماغ کا فعل قریب قریب بند ہو گیا۔
ـــــــ اور میں فرش پر اپنی تمناؤں آرزوں اور خیالات کے
طوفان کو سمیٹ کر بیٹھ گئی ـــــــ مجھے عجیب خیالات آنے
شروع ہوئے ـ پہلا خیال یہ تھا کہ میں اچھے کپڑے پہنے ہوئے نہیں
دوسرا خیال یہ تھا کہ میرے پاس پھولوں کے ہار نہیں ـ تیسرا روح فرسا
خیال یہ تھا کہ میں "سرخرو" نہیں چوتھا خیال یہ تھا کہ میں شائد

زیادہ حسین نہیں ——— کیسے باتیں کروں گی ۔ کیا کہوں گی ۔ کیا کیا سنوں گی ۔ اور سیکڑوں ایسے خیالات بھی آئے جن کو میں یہاں لکھنا مناسب نہیں سمجھتی ۔ کیونکہ اُن سے فطرت نسوانیت ضرورت سے زیادہ بے نقاب ہوتی ہے ۔ مرد آئے ہیں ۔ شریک خلوت ہوتے ہیں ۔ مگر کبھی دل کی اور میری یہ حالت نہیں ہوئی ۔ کبھی مجھے ایسے عجیب خیالات نے نہیں گھیرا ۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میری فطرت نسوانی اپنی تمام عریانیوں ۔ فتنہ سامانیوں اور سرشاریوں کے ساتھ میری عقل کی آنکھ کے سامنے ہے ۔ میری آنکھیں کھل گئیں لیکن ۔ جلد ہی یہ خیالی مناظر سے جھکا چور ہو گئی ۔ جذبۂ حیا اور مردانہ رعب مجھ پر پہلی بار اتنا چھایا کہ باوجود کوششوں ۔ اُبلتی ہوئی تمناؤں اور دلی جوش کے بھی میں اس کمرے کی طرف نہ جا سکی جس میں میر صاحب کے وجود کا مجھے یقین تھا ——— اب میں نے تمام حواس کو مجتمع کر کے اتنا کیا کہ دبے پاؤں دروازے تک پہنچی احتیاط سے جھانکا ——— کانپنے لگی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں ۔ چپکے سے ۔ سرعت کے ساتھ واپس آ گئی ۔ میں اپنی ان تمام حرکات اور خیالات کا تجزیہ کرنا چاہتی تھی مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا ——— اب مجھے یہ ڈر بھی معلوم ہونے لگا ۔ کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں ۔ اس جذبہ کے تحت پھر اٹھی اور دروازے تک پہنچی ——— لیکن اندر نہ جا سکی ——— ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ مجھے کوئی دیکھ کر ہنس تو نہیں رہا ——— لیکن اطمینان ہو گیا کہ کوئی باہر نہیں ہے ۔ کئی منٹ باہر کھڑی رہی ——— آخرش واپس چلی آئی ۔ بڑے آئینہ کے سامنے

اپنی صورت کو دیکھ کر خاموشی کے ساتھ ہنسی میری تمام ہمت کے کل پرزے ناکارہ ہوگئے۔ دماغی تصرف بیکل ہوگیا۔ نظام عصبی اب بے قابو ہوگیا۔ پر پرزے جھاڑنے کے باوجود اور کئی بار پر تو لنے کے بعد بھی میں اپنے ہوشباز کے پاس جاکر جانبازی کا ثبوت نہ دے سکی اور میں نے یہ یقین کرلیا کہ میں اپنے بل بوتے پر وہاں نہ جا سکوں گی۔

اتنے میں سردار صاحب اپنے کمرے سے باہر نکلے اور میرے پاس شاید روشنی دیکھ کر گانے کے کمرے میں آئے۔ مجھے دیکھ کر پوچھا "ایں! تم ابھی تک یہیں ہو" ۔ میں کچھ بھی جواب نہ دے سکی۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ "لیلیٰ! بات کیا ہے" ۔ میں پھر بھی نہ بولی۔ انھوں نے پھر کہا "آخر معاملہ کیا ہے؟ میں نے کہا "کچھ نہیں" ۔ وہ بولے "تو پھر تم اب تک وہاں گئی کیوں نہیں"

میری زبان سے بیساختگی میں یہ جملے نکل گئے۔ "ہمت نہیں پڑتی"! سردار صاحب بڑے جہاندیدہ انسان تھے۔ اس جملے کو سنکر ہنسے اور یہ کہتے ہوئے "اچھا وہ خود آئیں گے اور آپ کو پکڑ کر لیجائیں گے" ۔ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اب اس اُمید پر کہ وہ واقعی خود آئیں گے۔ میں مطمئن ہوکر سمٹ سمٹ کر قالین پر بیٹھ گئی اور بیٹھی رہی۔ میں گوش بر آواز تھی اور اس شعر کی صداقت اور لطافت کا محسوسانہ ثبوت دے رہی تھی

آہٹ پہ کان ۔ در پہ نظر ۔ دل میں اضطراب
پوچھو ستمکشوں سے مزہ انتظار کا

مجھے یقین ہے کہ کافی وقت صرف ہو گیا اور وہ نہ آئے۔ اب میں پھر حالت گو مگو اور جو کشم میں مبتلا ہو گیا۔ یہ کیفیت جاری تھی کہ میں نے پاؤں کی آہٹ سنی اور قبل از وقت گردن جھکا کر نیچے دیکھنے لگی۔ میرا جسم پھر کنکپانے لگا۔ میرے حواس باختہ ہو گئے۔ میر صاحب آئے۔ میرے سامنے کھڑے ہوئے۔ میں ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکی۔ وہ چپ کھڑے رہے ——— لیکن ——— خدا جانے کیوں وہ اب زینہ کی طرف چلے۔ ان کا پہلا قدم جیسے ہی زینہ پر پڑا میرے دل کی دنیا میں نیا تلاطم بپا ہو گیا۔ میں تڑپ گئی اور بسرعت تمام زینہ کے پاس پہنچی۔ میں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ میں نے ان کے جگر اور دل کو ہلا دینے والے الفاظ سنے ——— لیلیٰ! مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے لیے تمھارے دل میں جگہ نہیں ——— ورنہ میں ہرگز تم کو آج یہ تکلیف نہ دیتا ——— آہ! کتنے مغالطہ کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ اور کس قدر جگر خراش! اب میں نوعیت حالت کو سمجھ گئی اور اپنی فطرت کی مجبوریوں پر نفرین کرنے لگی۔ میں نے آپے میں آ کر کہا ——— "میر صاحب! خدا کے واسطے ......"

اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی میری زبان بند ہو گئی اور میری آنکھ سے ندامت کے آنسو بہنے لگے ——— میر صاحب پلٹے۔ انھوں نے میری حالت کا بغور معائنہ کیا ——— اور میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ مجھ کو پھر ہوش آیا خیال آیا کہ کہیں پھر میری حماقت سے یہ رنجیدہ ہو کر چلے نہ جائیں۔ ——— میں نے ہمت سے کام لیا اور ان کے چہرے کی طرف دیکھا ——— جو میں نے دیکھا! ——— جو میں نے محسوس کیا! ———

کبھی نہ بھولوں گی! ——— ان کی آنکھ میں بھی آنسو تھے۔ اور چہرے سے دلی غم الفت کے تاثرات اور محسوسات کا ترشح ہو رہا تھا۔ میں نے اسی کو بہتر جانا کہ ان کو جلدی سے گلے لگا لیا اور پھر ایک دم علیحدہ ہو گئی ——— آغوش کی گرمی میں میرے اور اُن کے آنسو جذب ہو کر خشک ہو گئے۔ اور اب ہم دونوں بدلے ہوئے انسان تھے۔ مجھ کو آغوش میں بھینچ بھینچ کر انھوں نے میرا اور شائد اپنا بھی سب حجاب نکال دیا ——— اور ہم قدرے بے تکلف ہو گئے۔ مگر میرے ہونٹ تشنہ تھے۔ اور تعجب ہو گا کہ اگر میں یہاں یہ صفائی کے ساتھ لکھ دوں کہ وہ قریب قریب تمام شب تشنہ ہی رہے ——— عجیب ذہنیت اور عجیب فطرت اور بڑے عجیب کردار کے مالک ہیں میرے میر صاحب! مجھ کو کمرے میں لے گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ نہ آنے کی وجہ بہت دیر بعد پوچھی جس کو میں نے صاف صاف بتا دیا بہت خاموشی سے سنتے رہے۔ ہم دونوں مسہری پر بیٹھے ہوئے تھے ——— اور بہت دیر تک دور دور بیٹھے رہے۔

میں نے مسکرا کر پوچھا ——— "سردار صاحب کہاں ہیں؟"۔ انھوں نے جواب دیا۔ "آپ کی والدہ کے پاس"۔ میں نے کہا "کیوں"۔ انھوں نے جواب دیا۔ "آپ کی والدہ کی جذبات نوازی کرنے کے لئے" میں نے دہرایا۔ "میری والدہ کی جذبات نوازی؟" انھوں نے کہا۔ "ہاں!"۔ میں نے پوچھا۔ "آپ سچ فرما رہے ہیں"؟ مختصراً فرمایا "ہاں" میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ اتنے میں میر صاحب اٹھ کر گئے

اور سردار صاحب کو بلا لائے اور پھر تاش کھیلنا شروع کر دیا۔ مجھ کو بڑا قلق گزرا۔ ارادہ کر ہی رہی تھی کہ تاش بند کراؤں اور نیند کا بہانہ کروں کہ میری والدہ نے سردار صاحب کو آواز دی اب سردار صاحب مجبور ہو گئے اور میر صاحب نے بھی اُن کو جانے کی اجازت دیدی۔

کچھ دیر کی خاموشی اور نظارہ بازی کے بعد میر صاحب نے مجھ سے میری حیات کے ابتدائی دور کے متعلق سوال کیا۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ انھوں نے متانت اور پوشیدہ وثوق کے ساتھ کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم آبائی طوائف نہیں ہو" میں نے خوش ہو کر پوچھا "آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا؟" انھوں نے فرمایا۔ "آپ کی باتوں سے آپ کی عادات خصلات سے آپ کے چہرے سے آپ کی شرافت سے۔ آپ کے گھر کے واقعات سے!" میں یہ معلوم کر کے بیحد خوش ہوئی کہ اِن کو پہلے سے میری حیات کے متعلق شکوک ہیں۔ ارادہ کیا کہ ابھی نہ بتاؤں ... نہوں نے ... کیا۔ بات کرنا چھوڑ دی۔ ناراض ہو کر بیٹھ گئے۔ آخرش مجھ کو سب کچھ بتلانا پڑا جس کو انھوں نے پوری توجہ اور طمانیت کے ساتھ سنا جس سے مجھ کو بھی بیحد تسکین ہوئی۔

الغرض یونہی صبح ہو گئی۔ اور اس شریف انسان نے باغباں کو پھول کی قیمت ادا کرنے کے باوجود پھول کی گردن کو نہ مروڑا۔ اسکی پنکھڑیوں کو نہ مسلا۔ ... خوشبو سونگھی۔ مگر پھول کو اک تک بھی

لانے کی زحمت نہ دی ——— خوبصورت بھونرا ———
پھول کا قدر شناس ۔ میرا بلبل ! میرا بھونرا !! کتنا شریف انسان!
رات آنکھوں میں کٹی ۔ مگر جنت میں گزری ۔ جو کچھ بھی گزری انوکھی
گزری ——— آہ وہ رات !

فقید المثال شب ! بے نظیر لطیف جذبات ! عین فطری سرشاری!
مکمل انسانیت ! اخلاقی رفعت ! قابل رشک کرداری ارتقا ! امتزاج طمانیت!
کیا تھی یہ شب !!

میں جتنا بھی اپنی قسمت پر رشک کروں کم ہے ۔ کیونکہ یہ وہ کیف پرور
رات تھی جو مجھے گمان ہے کہ کسی دولہن ہی کو نصیب ہوتی ہوگی ۔ مگر
طوائف کے مقدر اور نصیب میں کبھی بھی نہیں آسکتی !

---

۱۲ فروری سنہ ۱۹۳ء

شب میں تو اکثر آتے تھے مگر آج رفعت صاحب عین دوپہر میں
تشریف لائے ۔ دنیا میں پیٹ پالنے کے لیے ہزارہا انسان ملازمت کرتے
ہیں ۔ مگر ان سب کے اوقات مقرر ہیں ۔ کوئی دن میں چند گھنٹے کام کرتے ہیں

کوئی شب میں لیکن میرا پیٹ پالنے کا دھندا اتنا عجیب ہے کہ میرا دفتر چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ ہر دفتر کے ملازمین کے چند مخصوص افسر ہوتے ہیں۔ وقت پر آتے ہیں دیکھ بھال کرتے یا اپنا کام کرتے ہیں۔ اور چلے جاتے ہیں۔ ماتحت ان کے مزاج سے واقف ہوتا ہے اور اسی کے ویسا ہی برتاؤ کرنا پڑتا ہے لیکن غضب یہ ہے کہ میرے افسر مخصوص نہیں ہیں۔ چند نہیں ہیں بلکہ سازندوں کے گروہ کو چھوڑ کر ہر شخص میرا حاکم۔ مالک اور آقا ہے۔ ولی نعمت ہے۔ یہ حاکم جب چاہے آن ٹپکتے ہیں۔ اور مجھے ڈیوٹی پر مستعد ہونا پڑتا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جن کو پڑھنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک بوڑھی طوائف جتنی قیافہ شناس ہو سکتی ہے اور کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔ ہاں: ان آقاؤں میں سے کوئی خاموشی سے آتا ہے بنا سنورا ہوتا ہے۔ ایک خاص نشست سے بیٹھتا ہے۔ بھید ہی نہیں کھلنے دیتا جب تک کہ صاف جیت نہ آ جائے۔ کوئی ہنستا ہوا مسکراتا ہوا۔ منہ کھولے ہوئے آتا ہے اور اپنے ماتحت کو ہی سلام کرتا ہے۔ مطلب کی بات کبھی نہیں کرتا ادھر ادھر کی ہانکی۔ اور چلتا بنا۔ اور ہم ناچتے رہے! — حاصل نہ وصول۔ مگر نوکری۔ دینے کے لئے ہم مجبور ———— خیر ———— کوئی آقا ایسے تشریف لاتے ہیں کہ زینہ ہی سے ان کی گرج دماغ کو گرما لیتی ہے اور میں — "خدا خیر کرے!" کے جملے کہتے ہوئے ان کی طرف دیکھتی ہوں۔ وہ آتے ہی مجھ کو کبھی نہیں دیکھتے۔ بلکہ کمرے کو فرش کو قالین کو کرسیوں کو

تصویروں کو دیکھتے ہیں اور لانبی اور گہرا سانس لیتے رہتے ہیں۔ ہم آداب بجا لاتے ہیں تو وہ بغیر ہماری طرف دیکھے ہوئے تسلیم کہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بغیر ہمارے آداب کی صدا سنے ہوئے۔ تسلیمات۔ مزاج شریف۔ کہو۔ اچھی تو ہو۔" کہہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہم پر اتنی تکلیف وہ نظر ڈالتے ہیں کہ جیسے کوئی قصاب بھیڑ بکری کو دیکھا کرتا ہے۔ میں تو اکثر ایسی نظروں سے لرز جاتی ہوں۔ اب گفتگو ایسی شروع کرتے ہیں کہ جیسے ہم پہلے سے ہی ان کی کنیز۔ باندی۔ یا گھر کی لونڈی ہیں۔ آواز میں اتنی گرج ہوتی ہے اور لب و لہجہ اتنا سخت اور کرخت ہوتا ہے کہ میں تو میں! میرے نوکر تک ڈر جاتے ہیں۔ ایسے آقاؤں کا خاصہ ہوتا ہے کہ آتے ہی ایک آدھ حکم یا نوکروں کو غیر متعلقہ ضرور دیتے ہیں۔ جیسے "سگریٹ لاؤ۔ ذرا پانی بلوائیے۔" ہمارے موٹر سے تھرماس لاؤ" سیکل اندر رکھوا دیجیئے" وغیرہ وغیرہ اب ذرا دم لیکر نام وغیرہ پوچھتے ہیں۔ اگر پہلے سے جانتے ہیں تو نام لیکر مزاج پوچھتے ہیں کہ۔ اور سب کا مزاج پوچھ ڈالتے ہیں۔ مجھ سے ہی نہیں بلکہ نوکروں سے بھی بے محابا گفتگو کرتے ہیں ——

ایک گروہ ان آقاؤں کا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وہ گھر سے جب چلتے ہیں تو یہ تہیہ کر کے چلتے ہیں کہ اپنے دماغ کو طوائف کے دماغ سے ٹکرائیں گے۔ مقابلہ کریں گے۔ جیتیں گے۔ شکست پر شکست دیکر پچھاڑیں گے۔ ان کا اصول ہوتا ہے کہ طوائف کے یہاں جاکر۔ رحم و انصاف۔ ہمدردی خلوص صفائی اور سچ سے کام لینا

عین حماقت ہے بلکہ مکاری ۔ چالاکی ۔ دغابازی ۔ ریاکاری ۔ بے رحمی سے کام لینا عین مصلحت ہے ۔ دراصل ایسے لوگ بازی کو بازی ہی سمجھکر عشقبازی و ہوس رانی کرتے ہیں کامرانی ان کے قدم چومتی ہے ۔ یہ شیخی باز بڑے چلتے پرزے اور غضب کے شاطر ہوتے ہیں ۔ ان کے دام تزویر سے پہلی بار بچنا قریب قریب ناممکن ہے ۔ جب ہم کو ان سے پالا پڑتا ہے تو ہمیں بول جاتے ہیں ۔ لیکن اپنا پیشہ چلانے کے لیے ہم بہت کچھ انہیں سے سیکھتے ہیں ——— ایک گروہ ان افسروں کا ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ چھپ چھپا کر آتے ہیں ۔ بات کم کرتے ہیں ۔ آہیں زیادہ بھرتے ہیں ۔ اپنی شرافت اور خودداری کا اثر ڈالتے ہیں ۔ پیسہ زیادہ خرچ کرتے ہیں ۔ مشکل سے یا اتفاق سے کامیاب ہوتے ہیں ——— ایک طبقہ ایسا چھا جانے والا ہوتا ہے کہ آتے ہی مرعوب کر لیتا ہے ۔ اور ان کو کنے سے پہلے علم اور یقین ہوتا ہے کہ طوائف کی اُن کے سامنے کوئی ہستی ہی نہیں ۔ وہ بیحد مضبوط خوشنما ۔ خوش پوش ۔ سنبھل سنبھل کر ۔ اکڑ اکڑ کر باتیں کرنے والے ہوتے ہیں اور تمام شہر کے غنڈے اور شہدے ان کے زیر اثر ہوتے ہیں ۔ جو دیکھتے ہی ان کو سلام کرتے ہیں اور ۔ "کچھ حکم" ۔ کا لفظ بھی کہدیتے ہیں ۔ کبھی کبھی یہ شریف نما بدمعاش عورتوں کو پیٹ بھی دیتے ہیں یا پٹوا دیتے ہیں ۔ ان کی حکومت یہاں تک بھی ہوتی ہے کہ بعض دفعہ شہر بدر کرا دیتے ہیں اور ان کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا ۔ خدا کی پناہ ! میری بھی کیا زندگی ہے !

ہاں ! تو یہ افسر چاہے جب آتے ہیں ۔ اور حکومت جتاتے ہیں

ان کی مالی حیثیت کم ہو یا زیادہ ان میں کوئی قابلیت ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ یقین ہر ایک کو ہوتا ہے کہ طوائف ان کی لونڈی ہے نوکرانی ہے ضرور آئیگی۔ سلام کریگی سامنے بیٹھے گی سر میں درد ہو رہا ہو تب بھی باتیں کریگی۔ ہر کام نبیوڑیگی۔ مگر غلامانہ پیشی میں" حاضر رہے گی اور بغیر اجازت نہ بیٹھیگی۔ پان لگائیگی۔ کھڑے ہو کر پیش کریگی۔ خواہ یہ پیش کرنیوالا کوئی بھنگی۔ چمار۔ ہی کیوں نہ ہو مگر طوائف مجبور ہے کہ یہ سب کچھ اس کے لیے کرے۔

لیکن جو چیز مجھے ہنساتی ہے تعجب میں ڈالتی ہے طوائف کے پیشہ کو فروغ دیتا ہے۔ انتقام کی آگ بجھاتی ہے۔ ہماری نسائیت کو تسلیم دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ان آقاؤں میں سے نصف سے زیادہ بوالہوس ایسے ہوتے ہیں جو جون بدل کر خط غلامی لکھتے ہیں۔ آقا سے نوکر۔ نوکر سے غلام بنجاتے ہیں۔ ساری شیخی بھول جاتے ہیں کہتے رہتے ہیں "ہم آپ پر عاشق ہیں" در ندے کہیں کے!! اپنے نفس کے غلام ہیں لیکن غلامی ہماری کرتے ہیں اور وہ عشق کے پردے میں!

ایسی ایسی منتیں سماجتیں کرتے۔ پانوں پڑتے ہیں ——— ناک رگڑتے ہیں۔ زر لٹاتے ہیں۔ بیوقوف گدھے۔ بلکہ ہمنے نچائے ہیں۔ حکومت کرنے کے بجائے۔ ہماری شان میں نثر میں قصیدے کہتے ہیں۔ ہم ان کی حماقتوں پر ہنستے ہیں اور وہ اس کو اپنی حوصلہ افزائی اور قابلیت کی داد سمجھتے ہیں ——— اور یہ افسران ہوس شرائط غلامی اس وقت بیدھب قبول کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے نفس کی آنکھ کے

کسی زاویہ میں ہماری بناوٹی لگاوٹ۔ عشوہ گری۔ شکل و صورت اپنی تمام صناعی اور عریانی کے ساتھ جچ جاتی ہے جم جاتی ہے۔ ان کو خواب میں خیال میں ستاتی ہے۔ اور ان کی ہوس کی میزان میں ہماری فوقیت اور جاذبیت۔ جھونک اور جھٹکے دے دے کر اس وقت تبلاتی ہے۔ جبکہ وہ اپنی شریف۔ سادہ مزاج اور تصنع سے کوسوں دور بیویوں کو عیاشانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ معیار بازاری سے ناپتے تولتے ہیں۔ جلتے ہیں۔ کڑھتے ہیں اُن پر خفا ہونے کے لیے بہانے تراشتے ہیں۔ اُن کو ستاتے ہیں۔ اُن کو حکمہ اور دھوکہ دیکر للچائی ہوئی نظروں کے ساتھ رال ٹپکاتے ہوئے ہمارے آستانۂ عشرت پر خوب بن ٹھن کر خریدار بنکر۔ ہوس کی عینک لگا کر آتے ہیں۔ بری نظریں رکھتے ہیں برے سے برا سودا خریدتے ہیں زر لٹا کر آزار سول لیتے ہیں۔

کاش میں اپنی نادر گستی کی بیٹیوں اور شریف دلہنوں سے کہہ سکوں کہ جب تم کو علم ہو جائے کہ تمہارا شوہر عیاش ہو گیا ہے۔ تو بس اتنا ضرور کرو۔ کہ تصنع سیکھو۔ جبرا سیکھو۔ بیدنگا اور مشاقگی میں تنوع پیدا کرو۔ گفتگو میں تملق سے کام لو تخلیہ میں بے حیائی اور تھوڑی جنون پیدا کرو۔ اٹکنا۔ مٹکنا سیکھو۔ روٹھنا۔ منانا سیکھو۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرو۔ اٹھلانا سیکھو۔ شوہر کے خوش اور راغب ہونے کے وقت اپنی نسوانی شہنشاہیت کا رعب ڈالو اور تھوڑی دیر کے لیے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیلو۔ اور اپنے سرتاج کو چند ساعت کے لیے غلام بنالو لیکن اس کے جذبات کو پہچانو۔ ان کا احترام کرو۔ اور کوشش کے ساتھ

حقیقی جذبات نوازی کرو اور اُس کے رنگ میں رنگی جاؤ —

لیکن اندھا دھند غلامی۔ دائمی غلامی مت کرو۔ ہمیشہ کی سادگی کو شعار مت بناؤ۔ سنگار سے گریز مت کرو دور حاضر کا سامان مشاطگی اپنی حیثیت بلکہ کسی قدر اسراف کے ساتھ مہیا کرو۔ ہر روز ایک ہی قسم کا سنگار مت کرو۔ عیاش شوہروں کی طبیعت ایک رنگ۔ ایک طرز کے سنگار اور لباس سے جلد اُکتا جاتی ہے۔ بیجا شرم کو جس کو تم معیار شرافت سمجھ رہی ہو جس کی وجہ سے —— سچ جانو! —— تم اپنے شوہر کو کھو رہی ہو —— چھوڑ دو! ترک کر دو! —ہاں! گھونگھٹ کے ہتھیار کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ ہندوستانی عورت کیلئے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ مگر افسوس کہ مستورات اس سے معقول فائدہ نہیں اٹھاتیں۔ بلکہ رسماً۔ رواجاً اس کو اختیار کرتی ہیں۔ گھونگھٹ اس وقت تمہارے بہت کام کی چیز ہے جبکہ تمہارا منہ صاف ستھرا نہیں۔ اور تم نے سنگار نہیں کیا ہے یا لباس اچھا نہیں ہے حتی الوسع کوشش کرو کہ ایسے وقت اپنے شوہر کے سامنے نہ آؤ۔ مت جاؤ۔ اور یہ رسم تو بہت ہی بُری ہے کہ بعض خاندانوں میں میاں بیوی ہر روز ایک ہی پلنگ پر سوتے ہیں۔ ایسا کرنے سے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔ دلہن میں کوئی کشش نہیں رہتی۔ شوہر کے دل میں کوئی رغبت نہیں رہتی۔ گھر کی مرغی دال برابر ہو جاتی ہے اور وہ جوشِ محبت جو ابتدائی زمانہ میں راتوں کی نیند حرام کرتا ہے۔ کم ہوتے ہوتے اتنا دب جاتا ہے کہ اکتانے اور نفرت میں تبدیل

ہوجاتا ہے۔ میں انتہائی صفائی کے ساتھ کہوں گی یہ قصور ایک بڑی حد تک ہماری بہنوں اور ہمارے رسم و رواج کا ہے اس میں مردوں کی ذات ایک حد تک بے قصور ہے۔

عیاش مردوں کی نفسیات یہ ہے کہ وہ کبھی ناز اٹھوانا پسند کرتے ہیں تو کبھی ناز اُٹھانے کے لیے بھی تڑپتے ہیں۔ کبھی عورت کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ کبھی اس سے اتنا اجتناب کرتے ہیں کہ پاس بھٹکنا بھی پسند نہیں کرتے (ایسے مواقعات کو جانچو اور کبھی اُن کے پاس مت جاؤ۔ ان کے ساتھ راز و نیاز مت کرو) کبھی وہ عورت کو مجسمۂ حیا دیکھنا پسند کرتے ہیں تو کبھی سنگ مرمر کا عریاں بت دیکھنا چاہتے ہیں کبھی وہ ملکوتی سادگی پر قربان ہونا چاہتے ہیں۔ تو کبھی رنگین تتلی اپنے دل کے پھول کے پاس اُڑتی ہوئی۔ پاس آتی ہوئی۔ بھاگتی۔ ہاتھ نہ آتی ہوئی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس سے اُن کے دل میں گدگدی۔ طبع میں اشتیاق۔ نظر میں فریب اور رغبت دید پیدا ہوتی ہے۔

یہ کیا کہ غنچہ سربستہ کی طرح ان کے ہاتھ میں آئیں انھوں نے سونگھا۔ شگفتگی اور خوشبو غائب پائی انھوں نے ہاتھ لگایا تم مرجھائیں یا چھوئی موئی کی طرح بجھ کر سکڑ کر رہ گئیں۔ اور کلی کی طرح نہ کھلیں بلکہ گٹھڑی بنکر بھاری ہوگئیں اور اپنی تمام لطافتوں اور رعنائیوں کو چھپا کر ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑیں۔ اور اب انھوں نے تم کو پاؤں میں روند ڈالا پنکھڑیاں کھول ڈالیں اور پھر آنکھ اور ناک تک

لے گئے۔ ایک بہیمانہ سانس لیا اور جذبۂ شام کی تسکین نہ پاکر اس غنچہ کو انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا ناک پونچھتے ہوئے اور سر کھجاتے ہوئے باہر چلے گئے یا کروٹ لیکر لیٹ گئے آغوشِ رغبت میں انقباض کے دیو کو پاکر خیالی دنیا کی کسی رنگیں دیوی کے بت کی پرستش کو حسرت کو ساتھ لیے ہوئے سو گئے ——— !

کبھی کبھی یہ عیاشی جواب محبت۔ جواب جذبات جواب حرکات و سکنات مانگتے ہیں۔ مگر یہاں تو والدہ نانی اور خوشدامن صاحبہ نے یہ فرما کر رکھا ہے کہ نا! بیٹی شریف بہو بیٹیاں بھول کر بھی جواب نہیں دیتیں اپنے شوہر سے کبھی چٹ پٹ باتیں نہ کرنا۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے! وہ بڑے شرم کی بات ہے! ایسا کرنے سے دنیا یوں کہے گی۔ ویسا کرنے سے خاندان پر دھبہ آئیگا۔ آجکل سنگار کرنے سے شرافت جاتی رہتی ہے"۔ لیکن یہ شاید سب غیر عیاش لوگوں کی دلہنوں کی تلقین کیا جا سکتا ہے۔ عیاشوں کی۔ شوقین مزاجوں کی بیویوں کو ایسا سکھانا پڑھانا گویا ان کی حقیقی راحت اور اصلی زندگی کو برباد کرنا ہے۔ نئی روشنی کے نوجوان اور عیاشوں کی دلہنوں کے لیے اپنی محبت کا اظہار نہ کرنا۔ اپنے جذبات کو چھپانا۔ اپنی فطرت حرکات پر جبریہ قابو کرنا۔ بیحد نقصان دہ اور حماقت ہے۔ اکثر و بیشتر شوہر سے عشق لڑانے۔ گلہ شکوہ کرنے۔ عشقیات پر کلام کرنے۔ شوہر سے محبت کی غلط بولی کا جواب طلب کرنے اور خلیہ میں ترسانے تڑپانے اور محبت بھرا انتقام لینے کی سخت ضرورت ہے۔ ہندوستانی دلہن کے

دماغ میں سب سے زیادہ مضر خیال یہ جاہوتا ہے ،۔ اگر ہم نے اپنے شوہر سے کھلی کھلی باتیں کیں ۔ یا اپنے بین فطری جذبات کو ظاہر کر دیا یا ان کی محبت کا خواب زرا دل کھول کر دیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمارا شوہر ہم کو بدنشت متصور کرے گا یا شہوت پرست عورت سمجھیگا ۔

یہ خیال زہر قاتل ہے پند گیر ہے ۔ جب تک اس کو دماغ سے نہ نکالا جائیگا ہماری ہندی بہنوں کی ازدواجی زندگی حقیقی راحت سے لبریز نہ ہوگی ۔ اور عیاشی ان کے شوہروں سے کبھی نہ چھوٹے گی ۔ عورت کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ اپنی فطرت کو اپنی خاموشی اور اپنے جبر کی وجہ سے اپنے شوہر سے چھپا لیگی اور یہ خیال تو بالکل ہی مضر اور حماقت سے پُر ہے کہ عیاش شوہر محبت کے جواب اور فطری جذبات اور ہیجان کے اظہار سے اپنی عورت کو بدنہاد یا شہوت پرست یا بے شرم اور بے حیا سمجھے گا ! یا لکل غلط ہے ! بے بنیاد ہے ! ۔ عیاش شوہر کی یہ فطرت ہے کہ وہ بذات خود اور دل سے ان تمام باتوں کا اپنی بیوی سے طالب ہے ۔ بلکہ والہانہ اور مستانہ انداز میں جذبات کی پرواز اور محبت کی رنگینیوں کے ساتھ ! تخلیہ کی بے حجابیوں فطرت کی بے نقابیوں اور سرشاریوں کے ساتھ ! وہ تم کو محض اپنے لیے اپنی تنہائیوں ۔ اپنے تخلیہ کی رعنائیوں میں ! ۔ اپنے عالم خیال کی رنگینیوں بے حجاب سرمست ۔ سرشار اور اپنا ہم آہنگ چاہتا ہے ۔ وہ تم کو ہم راز ۔ ہم پرواز ۔ و ہمنوا دیکھنے کا طالب ہے ۔ وہ تم کو اپنے دل کی دنیا میں ۔ گل شگفتہ بوٹے محبت سے معمور اور جذبات سے بھرپور دیکھنا چاہتا ہے ۔

وہ یہ چاہتا ہے کہ اس محبت کی دوڑ میں کبھی وہ تمھارے پیچھے دوڑے تم بھاگو ہاتھ نہ آؤ۔ دانستہ ٹھوکر کھاؤ۔ گر پڑو۔ پکڑی جاؤ۔ جان چراؤ۔ ہاتھ پاؤں مارو۔ اور پھر دانستہ تھک جاؤ اور اپنی جوانی۔ دل وہ باغ اور جسم کو اپنی رعنائیوں کے ساتھ اس کی آغوش کے سپرد کر دو۔ مگر نیم باز آنکھوں سے متوالی نظروں سے اس کو شرابِ محبت کے جام پر جام دیتی ہو لیکن آنکھ بند کر کے آنچل سے منہ چھپا کر اور کلائی منہ پر رکھکر مجہول المطلق مت ہو۔ بلکہ محبت کے اس نشیلے بندے کی خبر رکھو۔ اگر ذرا نشہ میں کمی دیکھو تو ایک جام۔ دو جام بلکہ دس جام پلا دو اور پلاتی رہو۔ جب تک وہ مدہوش بلکہ بیہوش نہ ہو جائے۔ اور تمھارا متوالا نہ بنجائے ——!

اور ایسے ہی اس محبت کی دوڑ میں کبھی تم اس کے پیچھے دوڑو اس کو بھاگنے کا موقع دو جب وہ بھاگے۔ تم پیچھا کرو۔ تیزی سے دوڑو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنی نازک ٹانگوں سے اس کو کبھی پکڑ نسکوگی، مگر دوڑو اتنا جتنا کہ تم دوڑ سکتی ہو! تم شوق میں بہت تیز دوڑ گی۔ اگر تھکنا نہ چاہو تو اب بھی دانستہ ٹھوکر کھا کر سکتی ہو۔ مگر گرتے ہی اپنی نازک اور نسوانی کمزور چیخ ضرور نکالو۔ وہ اپنی دوڑ۔ اپنا زور۔ اپنا غرور سب بھول جائیگا۔ پلٹا کھائیگا۔ ہمدردی سے ہاتھ بڑھائیگا۔ ہاتھ میں ہاتھ لیگا۔ اب تم مسکرا دو۔ ہنس دو۔ کہدو۔ انتہائی شرارت کے ساتھ۔ انتہائی شوخی کے ساتھ کہدو۔ "دیکھا ہمنے پکڑ لیا نا!" اب وہ جھٹکا دیکر پھر ہاتھ چھڑائیگا۔ تم اٹھو۔ پھر بھاگو۔ پھر تھکو۔ پھر بھی دھوکہ دو گر پڑو۔ چیخو۔ چلاؤ۔ میں اپنی

نسائیت کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ وہ ہر بار تمہارے اس دھوکے میں پھنسے گا۔ ہر بار پلٹے گا۔ ہر بار پہلے سے زیادہ ہمدردی کا اظہار کرے گا اور پہلے سے زیادہ پیار کرے گا اور جب اس کو یقین ہو جائیگا کہ تم بالکل تھک کر چور چور ہو گئیں۔ وہ خود تمہاری آغوش میں گر جائیگا یا تم کو خود گود میں اُٹھا لے گا۔ لیکن وہ مستحق ہے کہ تم اُس کو اِس بار اپنی آغوش میں لو۔ وہ تم سے نہ سنبھلے۔ تم سنبھالو۔ وہ جان جان کر گرے۔ تم سنبھالتے سنبھالتے تھک جاؤ۔ یقین جانو مرد کو جتنا مزہ عورت کے تھکانے میں اور عورت کو جتنا لطف اس تھکنے میں آتا ہے وہ ازدواجی راحت کا ارتقا۔ معراج اور منتہائے عیش ہے۔ اب تم کہدو۔ "اُف! آپ کو کون سنبھالے!" اتنا کہکر خود اُس کی آغوش میں گھسنے کی کوشش کرو وہ شاید آغوش چرائے۔ مگر تم جسم نہ چُراؤ۔ خوامے ہو جاؤ۔ لیکن خود ہی آغوش سے تڑپ کر نکل جاؤ۔ اور ایسا اکثر کرتی رہو۔ اب وہ تم کو مردانہ گرفت سے دبوچ لیگا —— اور تم دونوں اس دنیا سے کسی دوسری دنیا میں پہنچ جاؤ گے۔ جو محبت کی بہشت کہلاتی ہے۔ لیکن یہاں بھی۔ سوتے والے کی گنجائش نہیں۔ جاگنا اور مئے الفت کے دور پر دور چلانا ضروری ہے۔ اس جنت میں سونا اور شرمانا۔ گندم کے دانے کے برابر ہے۔ جہاں چوکو گی۔ خود ہی بھٹکی جاؤ گی۔ بلکہ تمہارا آدم بھی اس جنت سے باہر نکال دیا جائیگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہارے اس قصور کو اور جنت سے اخراج کی خجالت کو کبھی نہ بھولے لیکن تم کو بھول جائے اور بھولا رہے۔ اور کسی اور کی یاد اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔ اور پھر تم کو خون کے آنسو رونا پڑیں۔

آج کیا لکھنے لگی ؟ ــــ میری ڈائری کو اس سے کیا تعلق ؟ خیر ! ممکن ہے یہ بھی میری نسوانی روح کی صدا ہو ! ۔

رفعت صاحب ایک وکیل کے صاحبزادے ہیں ۔ اچھی شکل وصورت کے آدمی ہیں ۔ دوپہر میں عشقیات کے دریا بہاتے رہے ۔ اور میرے دل کو کھولاتے رہے ۔ عشق ! عشق ! ۔ ہر شخص کو مجھ سے عشق ہے ۔ کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے بھی ہر شخص سے عشق ہو ۔ میں ان کی بکواس سنتی رہی ۔ دل میں ہنستی رہی مگر بے ہنگامی سے کڑھتی رہی ۔ لاکھ ان کو بنایا ۔ مگر نہ سمجھے ۔ اب کیا کروں ۔ آخر تو آقا ہیں کیسے ڈانٹوں کیسے کہوں کہ آپ تشریف لیجائیے ۔ دوپہر ہے میرے سر میں درد ہے ۔ میں سونا چاہتی ہوں ـــــــــــ اگر کہدوں تو ناراض ہو جائیں گے ۔ بگڑ جائیں گے ممکن ہے کہ سزا پر اگر نہ تلیں تو گالیوں پر اُتر آئیں ۔ ورنہ طعن و تشنیع تو کہیں گئی ہی نہیں ۔ یہ تو کہہ ہی دیں گے "دو کوڑی کی طوائف ! بد دماغ ! نخرہ بتاتی ہے ۔ ذلیل کمینی ! " اور پھر باہر جاکر بدنام کریں گے ۔ لیجئے ہمارا بازار ہی سرد ہو جائے گا ـــــــــــ میں نے تنگ آکر دو ساڑیوں کی فرمائش کی اور ذرا اٹھلا کر کہدیا " جب تک آپ میری فرمائش پوری نہ کریں گے میں ․․․․․․․․․ " یہ کہکر جان چھڑائی ــــ اور کمرے میں جاکر سو رہی ۔ یہ خدا جانے کس وقت گئے ۔ مگر شام میں پھر مع ایک بنڈل کے موجود تھے ۔ بڑے فخر سے دو بنارسی ساڑیاں میرے پاس

بھجوائیں اور حکم ہوا کہ ایک کو پہنکر بھی آؤں

گانا ہوا۔ بہت سے لوگ آئے۔ مگر وہ نہ آئے جن کے سامنے میں گانا اور ناچنا چاہتی تھی۔ اسی غصہ اور رنج میں میں نے بستر کو بھی خالی رکھا۔ اور کچھ دیر اس ڈائری کے لکھنے میں مشغول رہی۔

اب سونا چاہ رہی ہوں ۔۔ دیکھئے نیند آتی ہے یا کون ۔۔؟

۳/مارچ سنہ ۱۹۳۰ء

مطلع ابر آلود تھا۔ شام کے پانچ بجے ہوں گے۔ ہوا خوشگوار چل رہی تھی۔ فضا دوح پرور تھی میں غسل سے فارغ ہو کر بال بنانے کا ارادہ کر رہی تھی آج خلاف معمول خوش تھی۔ گنگنا رہی تھی اتنے میں میرے شب خوابی کے کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی اور میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ آنے والے کی کوشش یہ ہے کہ وہ اپنی آہٹ کو چھپائے اور آمد کی اطلاع نہ ہونے دے۔ میرے سامنے آئینہ تھا میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ اس چور کو آئینہ میں دیکھوں گی۔ مگر ڈر ہی تھی کہ کہیں کوئی نا معقول آدمی نہ ہو اور اتنے دیچے وقت کو اپنے

بے ہنگام سانس اور بے تکی باتوں سے تکلیف دہ اور روح فرسا بنادے
میں گنگنایا کرتی رہی اور آئینہ میں دیکھتی رہی ———— میں کتنی خوش
ہوئی جبکہ میں نے اس میں اپنے بھونرے کی شکل کی جھلک دیکھی ایک
خفیف لرزش نے میری خیالات کی دنیا سے مجھے اُڑایا اور کسی دوسرے عالم
میں پہنچا دیا۔ میں گنگنا ضرور رہی تھی۔ مگر آواز خفیف ترین ہلکی تھی اور
میں نے چپ ہوجانے کو ہی قرین مصلحت سمجھا۔ اتنے میں اُن کے دونوں
ہاتھ میرے سر کے پیچھے سے ہوتے ہوئے کانوں تک آئے۔ اسقدر دلکشش
اور ہوشربا اثر ان کی اس حرکت میں تھا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔
میرا دل سے چاہتی تھی کہ ان کے محبت بھرے ہاتھ میری آنکھوں سے
جلد از جلد مس ہوجائیں۔ اور ساز حیات کی کیفیات بیخودی کے رباب چنگ
کو رقص مضراب سے چھیڑ دیں اور میرے روحانی گوش ہوش دل کے
پردوں سے نکلتے ہوئے کیف بار نغموں کو اور ارض و سما کی فضائے روح پرور
میں مدغم ترانوں کے سریلے دھیمے اور دل کش گانوں کو آخری لمحاتِ حیات تک
سنتے رہیں۔ ہماری مرتعش روحیں منبع نغمہ بن جائیں ترانوں کے دریا بہادیں
اور کبھی روبرو ہوکر ہم دونوں جلترنگ بنجائیں

مگر چند لمحات آنکھیں بند رکھنے کے بعد اور یہ معلوم کرنے کے بعد
کہ ان کے ہاتھ آنکھوں تک نہ آئے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولدیں اور
اپنے محرم آئینہ سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ آئینہ کے ایک گوشہ نے
پوری غمازی کی اور ان کے مبہوت چہرہ کو افشا کردیا۔ میں نے معلوم کرلیا

اور نتیجہ نکال لیا کہ انھوں نے آئینہ اور آئینہ کی تصویر کے سامنے ہتھیار ڈالدیے
میں نے مقیم ہو کر پیچھے دیکھا اور پھر آئینہ کی طرف دیکھا جو میرے سامنے
کھڑکی میں رکھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ۔ بہت ہی آہستہ پیچھے ہٹی۔ تاکہ ان کے
کشادہ سینے سے میری کمر مس ہو جائے اور وہ مجھ کو اچانک آغوش
میں لے لیں۔ مگر کچھ دور پیچھے ہٹنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بھی اسی
رفتار سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ میں اس جذبات و کیفیات سے
مملو مذاق سے بیحد متاثر ہوئی۔ مگر میں نے ان کو شکست دینے کا
ارادہ کر لیا اور ذرا تیزی سے اچانک پیچھے ہٹ کر لڑکھڑائی۔ اور
وہ مجبور ہو گئے کہ مجھے سنبھالیں ـــ "ہوں ـــ ہوں ـ ں ـ ں..."
کا بے اختیاری لفظ ان کی زبان سے نکلا۔ جس کا لہجہ انسانی ہمدردی سے
معمور تھا۔ انھوں نے سنبھالا ضرور ـــ مگر بجائے آغوش میں لینے کے
مجھے سہارا دیکر کھڑا کر دیا۔ جس سے میری امیدِ مسرت آمیز دل شکنی ہوئی۔
اب میں ان کی طرف رُخ بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ آنکھیں ملتے ہی ہم دونوں
محجوب ہو گئے ایک شوخ اور شریر ہنسی ان کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔
ممکن ہے کہ میری بھی یہی حالت ہو مگر میرے دماغ پر سرور و انبساط سے
دبے ہوئے جذبات مسلط تھے جیسے میری آنکھیں اور گال مجھے کچھ
باہر کو نکلتے ہوئے اور گرم گرم معلوم ہو رہے تھے میں نے جلدی میں
اپنے دونوں ہاتھ چہرہ پر رکھ لیے اور ایک دو انگلیوں سے آنکھوں
کو بھی دبا لیا جس سے مجھے اپنے بہتے ہوئے جذبات میں کچھ تسکین
محسوس ہوئی ــــــــ میں نے اسی حالت میں زرنیز

...نے ... آہستہ لہجہ میں کہا ——— "پیر صاحب! تم بڑے وہ ہو .... تمہیں مار کے ٹکڑے کر دیں"۔ یہ کہکر میں نے آنکھیں کھولدیں اور اس جذبات پر بے پناہ قابو رکھنے والے انسان کو دیکھا۔ جو چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم تھا۔ اس کی ضیا پاش صورت سے محبت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ جو میرے خرمن ہستی پر گر کر شعلہ افروزی کر رہی تھیں ——— مگر میری مایوسی کا اب خیال اسکو سرد کرنے کے بجا دو دل پیدا کر رہا تھا۔

ہنسو تو کو جلاؤ تو دھواں ہوتا ہے
دو دل عشق کی خامی سے عیاں ہوتا ہے

کے مصداق انقباض پیدا کر رہا تھا۔ اور میرے جذبات کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اور یہ سب اس لیے تھا کہ مجھ کو ان کے اپنا ہونے کا یقین نہ تھا ——— "وہ میرے مرد نہ تھے" ———

یہ بد اعتمادی اور خلش طوائف کو آخری دم تک ہر مرد کے متعلق رہتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے حسن کی زنجیروں اور تصنع اور ریاکاری کی بیڑیوں کے علاوہ اور کوئی پائدار سامان قید "بھگوڑے مرد" کے لیے نہیں رکھتی۔ اور مرد پر اعتماد عورت کی نفسیاتی فطرت کا عین اقتضا ہے۔ اور یہ اعتماد طوائف کو کبھی میسر نہیں ہوتا۔ اور میرا خیال ہے کہ مرد بھی عورت پر اسی قدر اعتماد کی عین فطری خواہش رکھتا ہے۔ بلکہ کسیقدر زیادہ۔ میں یہاں یہ بھی لکھ دوں کہ اس اعتماد کے بغیر حقیقی خوشی اور

اصلی زندگی مرد اور عورت کو کبھی نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تمدن اور مذہب نے تکمیلِ حیات کے لئے نکاح کو ناگزیر تسلیم کیا ہے جس کے ذریعہ بیوی اور شوہر کو لازوال نعمتیں۔ راحتیں اور زندگی گزارنے کی سہولتیں عطا فرمائی ہیں۔ جو ایک طوائف اور عیاش کو کبھی میسر نہیں آسکتیں۔

اب میں پیچھے ہٹی اور میں نے ایک خوبصورت ساڑی پہنی اور پہننے کے دوران میں اپنے اوپر پورا قابو پا لیا۔ ایسا ہی شائد اس طرف بھی ہوا ——— وہ چارپائی پر بیٹھ گئے اور میں اُن کے سامنے کھڑی رہی ——— انھوں نے فرمایا ——— لیلیٰ آج تم بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہو" میں نے چڑ کر کہا ——— جبھی تو آپنے اتنا ستایا ہے" وہ بولے۔ "ستایا! میں نے! تم کو"! میں نے کہا۔ "ہاں! آپ نے مجھ کو"! انھوں نے کہا ——— "کیا کہہ رہی ہو لیلیٰ"! ——— میں نے بعجلت کہا۔ "سچ کہہ رہی ہوں بندہ نواز!"۔ فوراً بولے "یہ آج کس قسم کی گفتگو ہے" ——— میں نے بگڑ کر کہا "آپ میرے یہاں تشریف نہ لایا کریں گے"۔ کہنے کو کہہ گئی مگر بیحد ڈر گئی۔ اور مجھے بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا"۔ جیسے ہی وہ چلنے لگے تو میرا سانس پھولنے لگا اور دم گھٹنے لگا۔ میں نے بوکھلاہٹ کے ساتھ دروازہ روک لیا۔ اور ہاتھ پھیلا کر چوکھٹ پکڑلی۔ مگر دل میں بیحد محجوب تھی۔ وہ رک گئے اور کہنے لگے۔ "لیلیٰ! میں مشکل سے اس مذاق کا متحمل ہو سکتا ہوں"۔ میں نے کہا جی ہاں!

بر میں جانتی ہوں" انھوں نے کہا پھر کیوں ایسا کرتی ہو" میں نے کہا۔
شاید اپنی فطرت سے مجبور ہوں" وہ بولے اور کتنا اچھا بولے۔ لیلیٰ!
تم غلطی پر ہو۔ تمھاری فطرت ایسی نہیں ہے۔ ہاں۔ البتہ ماحول
سے مجبور معلوم ہوتی ہو" ـــــ میں نے فوراً کہا۔ ہاں! آپ
سچ فرماتے ہیں۔ میں نے کئی بار معافی مانگنا چاہی۔ مگر.......
انھوں نے بات کاٹ کر کہا۔" مگر اظہار نہ کر سکیں۔ یہ بھی تمھارے
ماحول کا اثر ہے"۔ میں نے ٹھنک کر کہا۔" تو کیا آپ مجھے معاف
نہ کریں گے؟ انھوں نے کہا۔" میں معاف تو جب کرتا جب تمھارے
جملے میں کوئی اصلیت ہوتی۔ یہ نہ تمھارا مکان ہے۔ نہ تمھیں کوئی
اختیار ہے نہ تم کسی کو اپنے یہاں آنے سے منع کر سکتی ہو۔ ـــــ
البتہ جس چیز نے مجھے رنج پہنچایا وہ میرا یہ خیال تھا کہ تم مجھے اپنے
خانۂ دل میں آنے سے منع کر رہی ہو۔ جس پر تمھیں ضرورت سے
زیادہ قابو اور اختیار ہے"۔ میں نے ان الفاظ کی سچے دل سے
قدر کی اور کہا ـــــ" آپ آفت کے پرکالے ہیں۔ مگر بڑے اچھے
ہیں" ـــــ وہ ہنسے اور بولے۔" جبھی تو گھر سے باہر نکالا جا رہا تھا"
میں نے خجل ہو کر کہا ـــــ" خدارا زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ اب
کبھی ایسا نہ بولونگی"۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے معاف
کر دیا۔ اور میں خوش ہو گئی ـــــ اِدھر اُدھر کی گفتگو ہونے کے بعد
انھوں نے مجھے ساتھ لیکر آبادی سے دور جانے اور سیر کرنے کی
خواہش کا اظہار کیا میں نے والدہ سے جا کر اجازت مانگی۔ انھوں نے

خود ساتھ چلنے اور سردار صاحب کو ساتھ لینے کی شرط لگائی تو میں نے میر صاحب سے مرزا صاحب کو بھی ساتھ لے لینے کی فرمائش کی اور وہ چلے گئے۔

میں اور والدہ تانگے میں سوار ہو کر ایک تبلا لے ہوئے مقام پر پہنچے اور وہاں سے میر صاحب کی معیت میں آبادی سے بہت دور نکل گئے —— یہ میرے لیے پہلا موقع تھا۔ کہ میں نے فطرت کے نظاروں اور دلکشیوں سے صحیح معنی میں حظ اٹھایا —— سردار صاحب کے پھڑکتے ہوئے چٹکلے۔ مرزا صاحب کی مخلص اور معصوم حرکتیں۔ میر صاحب کی سردار صاحب پر پھبتیاں اور مجھے میٹھی میٹھی خبیاں۔ یہ سب اسقدر تھا کہ میرا جی وہاں سے واپس آنے کو نہ چاہتا تھا۔ فضا بیحد دلکش تھی مطلع ابر آلود تھا۔ کچھ ترشح ہو رہا تھا۔ ہرے بھرے کھیت۔ سرسبز اشجار۔ دلفریب میدان دل میں گدگدی پیدا کرنے والی ہوا —— ایسا سامان نشاط تھا۔ کہ جسم پھریریاں لے رہا تھا۔ اور دماغ شاعرانہ پرواز کر رہا تھا اور حضرت دل کو عشق کا درس دے رہا تھا۔ میں اور میر صاحب پیدل گھومتے گھومتے کئی بار سب لوگوں سے علیحدہ ہوئے۔ مگر میر صاحب۔ تہذیب کے بنے ہوئے انسان تھے ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے باتیں بیحد خوشی آمیز اور بہجت افزا کرتے رہے مگر اس بھونرے نے باوجود وسعت اور قربت کی ایکبار بھی اس کی گلابی پنکھڑیوں کے پاس آ کر بھنبھنانے

گیت سنانے۔ اور امرت رس پینے کی کوشش نہ کی۔ عجیب ہے یہ بھونرا!! شب ہوگئی اور ہم مکان واپس آگئے۔ اور یہ لوگ ہم کو چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔

گیارہ بج گئے اور یہ خوش باش پارٹی پھر آن دھمکی۔ گانا ہوا۔ فرمائش پر ناچ ہوا۔ ساڑھے بارہ بجے گانا ختم ہوا۔ سب چلے گئے مرزا صاحب بھی چلے گئے اور محض سردار صاحب اور میر صاحب رہ گئے۔ جس سے میری طبیعت اس قدر خوش ہوئی کہ میں کھانا بھول گئی۔ اور یاد دلانے پر خیال آیا کہ آج کھانا نہیں کھایا ہے۔ الغرض کھانا سب نے ساتھ کھایا اور میں اور میر صاحب اپنے شب خوابی کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ وہاں پہنچکر خلاف معمول مجھے حیا نے آن دبایا اور میں بھینچ بھینچا کر سمٹ سمٹا کر رہ گئی۔ اور میری بولتی بند ہوگئی۔ میر اثر۔ یا یہی کیفیات میر صاحب پر طاری تھیں میں نے نہ ایسا کوئی شریک بستر دیکھا تھا۔ اور نہ مجھے شب کی خلوتوں میں کبھی ایسی کیفیات۔ خیالات۔ اور تاثرات کا مشاہدہ ہوا تھا۔ میں لاکھ سمجھنا چاہتی تھی مگر نہ سمجھ سکتی تھی۔ میں لاکھ حیا کو دور کرنا اور وقت کی ضرورت سے زیادہ قدر کرنا چاہتی تھی۔ مگر نہ کر سکتی تھی۔

گھنٹے گزر گئے۔ مشکل سے دو چار باتیں قابل تذکرہ ہوئیں ورنہ خاموشی اور معمولی گفتگو تھی۔ مگر اس سادگی اور عدم ہیجان کے باوجود راحت کا دزن اتنا تھا کہ سہارے سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ اور اتنا

دباتا تھا۔ کہ میں اور وہ دونوں لب بند رہنے پر اور دل ہی دل میں مزہ لینے پر مجبور ہو جاتے تھے — اور غضب یہ ہے کہ ایک ہی مسہری پر دور دور بیٹھے تھے — میں نے سوچا اور بہت سوچا۔ دل کڑا کر کے ہمت کی اور اُن کی آغوش کے سمندر میں آنکھ بند کر کے کود گئی۔ اور کھوئی گئی۔ مدہوش کن خیالات میں ڈوب گئی۔ شل ہوگئی۔ سرد ہوگئی — اور اس وقت تک ہوش میں نہ آئی جب تک کہ اُن کے ہونٹوں کی گرمی نے میرے لبوں اور پیشانی کے ذریعہ برقی حدت نہ پہنچادی — میں نے کہا۔ "میر صاحب! یہ کیا بات ہے کہ میں باوجود طوائف ہونے کے آپ سے شرماتی اور ڈرتی ہوں" — انھوں نے جواب دیا۔ "میں خود۔ خدا جانے۔ تم سے کیوں شرماتا اور بیحد ڈرتا ہوں" — میں نے پھر پوچھا — "اچھا بھلا یئے تو کہ ہم ایک دوسرے سے کیوں شرماتے اور کیوں ڈرتے ہیں"۔ انھوں نے جواب دیا۔ "میں اس کو کچھ کچھ سمجھتا ہوں۔ مگر بتلانے سے ڈرتا ہوں"۔ میں گود سے نکل کر اُٹھ بیٹھی اور میں نے اشتیاق کے ساتھ کہا۔ "آپ کو میری قسم! بتلائیے آپ کیا سمجھتے ہیں" — وہ بولے — "میں کیسے بتلاؤں ہمت نہیں پڑتی" — میں نے کہا — "نہیں نہیں ضرور بتلایئے۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی" — انھوں نے مسکرا کر کہا — "مشکل تو یہ ہے کہ تم ناراض نہیں ہو سکتیں" — کسقدر ٹھیک تھی ان کی یہ بات! — لیکن میں نے پھر کہا۔ نہیں نہیں! میں ضرور ناراض ہو جاؤنگی! — انھوں نے کہا۔ "اچھا تم ناراض ہو کے دکھلاؤ — پھر میں کوشش کرونگا کہ

تتلاؤں" ۔ میں نے کہا ۔ "اچھا میں کوشش کرتی ہوں" میرے اس جملہ پر وہ خوب ہنسے اور میں نے واقعی کوشش کی کہ میں ناراض ہو جاؤں اگر نہ ہو سکوں تو کم از کم ناراض کی سی صورت ہی بنا لوں ۔ مگر نہ یہ کر سکی نہ وہ کر سکی اور وہ برابر مسکراتے رہے ۔ اور میرے ہونٹوں پر بھی تبسم کھیلتا رہا ۔ میں زچ ہو کر بولی ۔ "میں نہیں ہو سکتی" ۔ وہ بولے ۔ "کیا نہیں ہو سکتی" میں نے جواب دیا ۔ "وہی نا ۔ ناراض" وہ ہنسے اور اب میں بھی ہنس پڑی ۔ کتنے عجیب اور اچھے ہیں میرے میر صاحب ____________

میں نے پھر کہا ۔ "اچھا پہلے اتنا تو بتلائیے کہ آپ تتلانے سے کیوں ڈرتے ہیں ؟ میر صاحب نے فرمایا ۔ "اس کا سبب خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا" ۔ میں نے یونہی کہلا بیا ۔ "مگر اس کا سبب میں جانتی ہوں" ۔ وہ بولے "اچھا تو بتلائیے" ۔ میں نے کہا ۔ "میں بھی تتلانے سے ڈرتی ہوں" ۔ انھوں نے کہا ۔ "آپ کیوں ڈرتی ہیں ؟" میں نے کہا ۔ "میں اپنے ڈر کی وجہ بھی جانتی ہوں" ۔ وہ اشتیاق کے ساتھ بولے "ہاں تو بتائیے نا ؟" میں نے ناپ تول کر کہا ۔ "جب تک آپ نہ تتلائیں گے میں بھی نہ تتلاؤں گی !" انھوں نے کہا ۔ "اچھا یہ بات ہے !" ۔ میں نے کہا "ہاں !" ۔ وہ ایک اطمینان کا سانس لیکر بولے "بس تو معلوم ہو گیا !" میں نے کہا ۔ "کیا" ؟ ۔ انھوں نے کہا "یہی کہ تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے" ۔ اس جملے نے میرے جھوٹ کا پول کھول دیا !

اور میں اس کی تردید نہ کر سکی ۔

اتنے میں سردار صاحب جو میری والدہ کے کمرے سے نکل کر ۔ اور چھپکر ہماری باتیں سن رہے تھے باہر کھڑے کھڑے ہی ذرا زور سے بولے ۔ "آپ دونوں ڈرپوک جانور ہیں ۔ تھوڑے سے بیوقوف ہیں ۔ ہرگز نہیں جانتے کہ خلوت کی راتیں کسقدر قیمتی ہوتی ہیں ۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے کیوں شرماتے اور کیوں ڈرتے ہیں ؟" ۔ میں باہر نکلی اور سردار صاحب کو اندر لائی اور میں نے لجاجت سے کہا ۔ "خدارا آپ ہی تبلائے کہ ہم دونوں کیوں شرماتے اور کیوں ڈرتے ہیں ؟" ۔ سردار صاحب بولے ۔ "آپ دونوں کے اوپر ایک بھوت سوار ہے" میں نے پوچھا "کونسا بھوت ؟" سردار صاحب نے کہا ۔ "اس بھوت کے باپ کا نام مرزا تخئیل اشرف ہے" میں نے کہا ۔ "مگر اس کا نام کیا ہے ؟" ۔

انھوں نے میر صاحب کی طرف دیکھکر کہا ۔ "اس کے بیٹے کا نام مسٹر ٹین میں ہے ۔ پوتے کا نام مسٹر ہوا باز ہے ۔ پڑپوتے کا نام مسٹر ہوس ہے ۔ اور سکڑ پوتے کا نام حضرت فسق ہے" ۔ میں نے پھر بیچینی کے ساتھ کہا ۔ "مگر اس اصلی بھوت کا کیا نام ہے ؟" سردار صاحب نے پھر جاری کیا ۔ "اس کے دادا کا نام میر سودا غالب ہے پڑدادا کا نام کیفی طالب ہے سکڑدادا کا نام

شیخ ناسخ راہب ہے" — میں نے ذرا تیزی کے ساتھ کہا : مگر اس بھوت کا کیا نام ہے؟ — اب میر صاحب نے بھی پوچھا — ہاں! سردار صاحب تو اُس بھوت کا کیا نام ہے؟ — سردار صاحب نے چٹکی لی اور کہا — "اچھا! آپ بھی پوچھنا چاہتے ہیں! سنئیے اس بھوت کا نام عشق ہے جب یہ بھوت سوار ہو جاتا ہے تو انسان کو بیکار اور لایعنی بنا دیتا ہے۔ اس بھوت کی غذا خون ہے — اور یہ جان کی بھینٹ لیکر — سر سے اترتا ہے" میں نے اور میر صاحب نے سردار صاحب کے ان جملوں کو سنا۔ کچھ سمجھے کچھ سمجھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا کچھ پوچھنا چاہا۔ مگر نہ کہہ سکے۔ الغرض سردار صاحب بیٹھ گئے اور میر صاحب کے ایماء پر اور میری مرضی کے خلاف تاش کھیلنا شروع کر دیا — اور یہ رات خوش گپیوں۔ مذاق اور لطیفوں میں گزر گئی

مگر اندرونی کیفیات میں وہ سرور و انبساط تھا۔ کہ جس کی یاد کے خیال سے ہی معمولی سے کہیں زیادہ فرحت حاصل ہوتی ہے ؂

بسکہ ذکرالعیش نصف العیش ہے
یاد ایام فراغت ہی سہی

احاطۂ جذبات لطیف — سرشادی تکمیل — ہجوم آرزو۔ تمنائے دور جام حیات۔ خوشی آمیز بے بسی نزہت و نفاست فضا۔ لمعات محبت گونگی بہری اور اندھی محبت کیفیات ہو سنرا —

خاموشیٔ صبر آزما .... اور گیا گیا ....
یہ تھا اس رات کا بیش بہا سرمایہ ـ جس کی میں مالک تھی! کبھی نہ بھولونگی اس شب نیرنگ کو کبھی نہ بھولونگی

۱۷ / مارچ ۱۹۳۰ء

گذشتہ دو ہفتے اپنی تمام بے ہنگامیوں نیرنگیوں بوقلمونیوں اور اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ گذار گئے ـ گذرتے ہی رہتے ہیں یہ دن! ——— ہاں کچھ ہلکے سے نقوش قلب پر رہجاتے ہیں اور وہ بھی امتداد زمانہ سے اسقدر مدہم ہو جاتے ہیں کہ نقش بر آب کی طرح اُن کی تشکیل ہی فنا سے متصل ہوتی جاتی ہے ـ البتہ زندگی کے بحر مواج میں ہر روز سرگرمی یا افسردگی کے حباب رونما ہوتے رہتے ہیں اور اپنی حیاتِ کے مختصر لمحات کو بعجلت ختم کر دیتے ہیں ـ اور یونہی ہوتا رہتا ہے ـ اس تسلسل لا انتہا ہی اور اسکی ہست و بود کا نام عالم نیرنگ و بو ہے! ——— ۱۷ / مارچ کی دلنواز شام اور روح پرور شب اپنی نوعیت کے اعتبار سے میری زندگی کی تمام راتوں میں سب سے زیادہ محبوبیت اور کیف انگریزی لیے ہوئے تھی بلکہ غیر فراموش کن احساس ہے کہ یہ زریں اور انمول شب تھی ـ مجھے

گمان ہے کہ یہ شب اب پھر نہ آئے گی ۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ شب ہر ایک ہی بار آتی ہے ۔ دنیا کے بہترین دورِ حیات کی عمر محض پانچ گھنٹے ہوتی ہے ! —

چاند کے رنگ سے ملتی ہوئی خوبصورت زریں سہ پہر کی جذبات پیدا کرنے والی رو پہلی گھڑیاں گذر رہی تھیں ۔ اور کسی کی یاد کی چٹکیاں لے رہی تھیں ۔ آخرش وہ آئے جن کو میں اپنے دل پر جارحانہ قبضہ کیے ہوئے محسوس کرتی تھی ۔ اور ہر شام کی دلگداز تنہائیوں میں یاد کیا کرتی تھی ۔ میں اور میرا گندہ دل ! اور یہ پاکیزہ خیال جس کی میں پرورش کر رہی ہوں کسقدر عجیب بات ہے ! —

وہ حسب عادت آہستہ آہستہ آئے اور میرے خاص کمرے میں داخل ہو گئے مجھے تأسف ہے کہ آج وہ دل میں گدگدی پیدا کرنے والی کوئی شرارت نہ کر سکے کیونکہ جیسے ہی میں نے منہ دروازے کی طرف پھیرا ۔ میرا ان کا سامنا ہو گیا ۔ دونوں طرف آداب تسلیمات غائب ۔ سکتہ طاری ۔ اور تبسم موجود ہو گیا ۔ جس نے جلد ہی معنی خیز ہنسی میں تبدیل ہو کر قفل سکوت کو توڑ ڈالا

انھوں نے فرمایا — "کیوں لیلیٰ ! کیا کر رہی ہو ؟ میں نے جواب دیا " یاد کر رہی ہوں " ۔ انھوں نے پوچھا — کس کی ؟ میں نے کہا — "کسی کی !" انھوں نے پوچھا — "کون ہیں آخر وہ ؟" میں نے کہا — " ہیں وہ ایک !" انھوں نے کہا — " وہ نہیں ؟ میں نے

کہا۔ "جی نہیں" انھوں نے پھر سوچا اور کہا "مگر بتاؤ تو وہ کون ہیں؟" میں نے کہا۔ "نہیں بتاتے" وہ بولے۔ اچھا نہ بتاؤ۔ ہم پوچھتے ہی نہیں" میں نے شوخی سے کہا۔ "اور آپ کو کون پوچھتا ہے"؟ وہ ٹھنڈا سانس لیکر بولے۔ جی ہاں ہمیں کون پوچھتا ہے! ہم جیسوں کی آپ کے یہاں پوچھ کہاں! ان ادبی لطافت سے پر جملوں کو سنکر میں پھڑک گئی اور میں نے بات میں بات پیدا کی۔ "ممکن ہے! بالکل ممکن ہے! کوئی بغیر پوچھے ہی پوجتا ہو"! انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔ "پرستش حال ہی نہیں تو پرستش کہاں"؟ میں نے ذرا بنانے والے تبسم کے ساتھ کہا "تو یہ کہئے کہ آپ کو ایک ایک پوچھ گچھ کرنے والے کی ضرورت ہے۔ جو ہر قدم پر ٹوکے۔ روکے"۔ انھوں نے کہا۔ "جی نہیں روکے ٹوکے نہیں۔ بلکہ کچھ کے دے۔ چمکے لگائے"۔ میں نے کہا۔ "کیا آپ بھوکے ہیں؟" انھوں نے استعجاب کے ساتھ کہا۔ "کیا معنی"؟ میں نے ہنسکر کہا۔ "کھائیں گے آپ؟" انھوں نے کہا۔ "کیا"؟ میں نے بعجلت کہا۔ چرکے" !! ________ انھوں نے داد دینے والے انداز میں کہا۔ جس سے میں بیحد خوش ہوئی۔ لیلیٰ! بڑی ستم ظریف ہو آج بے پناہ برس رہی ہو۔ حیا کی گھٹاؤں کو ہٹا رہی ہو۔ ہم کو گھٹا رہی ہو۔ بنا رہی ہو۔ اور بنا کر موتی برسا رہی ہو۔ جوبن بھی پھٹا پڑتا ہے۔ غضب کا نکھار ہے۔ جوانی کا باغ پر بہار ہے"۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "مگر باغباں۔ فتنہ سامان۔ نوجوان۔ جانِ جہاں۔

میرا مہمان ہے۔" انھوں نے جواب دیا" مگر بے چارہ ہیجان پریشان پرارماں ۔ بے سروسامان ۔ نالہ کناں ۔ چاک گریباں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے ٹوکا ۔" بس بس! زیادہ قافیہ پیمائی نہ کیجیے ۔ انھوں نے فرمایا ۔۔ آج بڑی خوش معلوم ہوتی ہو کیا بات ہے" میں نے دونوں آنکھوں کو قدرے چھوٹا کر کے کہا ۔" ایک بات ہے"۔ انھوں نے پوچھا ۔" کیا بات ہے کیا کچھ واہیات ہے"؟ ۔ میں نے چیخ کر کہا ۔" بڑی بیڈھب بات ہے ۔"! انھوں نے تحسین آمیز انداز میں کہا ۔ جی ہاں! آپ کی کیا بات ہے! مگر وقت کی بات ہے۔ آج جو بات ہے ۔ کرامات ہے لیکن یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ آپ کی ہر بات بھی ایک مانت ہے ۔ اور کسی میں یہ بات کہاں"! میں نے کہا ۔" یہ آپ کا حسنِ ظن ہے" ۔ وہ فوراً کہہ اٹھے ۔ جی ہاں! زن کا حسن ہے ۔" میں نے اس فقرے سے لطف لیا اور گفتگو کا رُخ بدلنے کے لیے کہا آج میں خدا جانے کیوں خوش ہوں ۔ مگر بیحد خوش ہوں" ۔ انھوں نے نہ مانا اور پھر ایک فقرہ چسپاں کیا ۔" مگر جامہ سے باہر نہ ہو جیے گا" میں نے برجستہ مگر ڈرتے ڈرتے کہا آج آپ آپے سے باہر معلوم ہوتے ہیں ۔" میری توقع کے خلاف وہ اس جملہ سے بے انتہا محظوظ ہوئے اور بڑی بیڈھب داد یہ دی کہ میرا منہ چوم لیا جس سے شیرازۂ احساسات منتشر ہو گیا اور میں چند لمحات کے لیے بھول چکی اور محو ہو گئی

وہ بھی سنبھلکر خاموش بیٹھ گئے اور میں بھی ذرا پیچھے ہٹکر بیٹھ گئی
انھوں نے اپنے جذبات کے ہیجان کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے
کہا — "لیلیٰ! کیا یہ ممکن ہے کہ تم مجھ سے محبت کرسکو" ! میں نے کہا۔
"محبت کرسکوں" ؟ ۔ انھوں نے کہا — "ہاں" ! میں نے کہا ! —
"کرسکنا کے لفظ پر آپ نے غور فرمایا ہے" ۔ انھوں نے جواب دیا" —
"جی ہاں" — میں نے کہا — "ایک طوائف ہر شخص سے محبت کرسکتی ہے۔
کرسکنا ایک ایسا لفظ ہے جس کو محبت کے ساتھ وابستہ کرنے سے محبت کی
توہین ہوتی ہے — کیا ایسا نہیں ہے ؟" ۔ انھوں نے کچھ سوچکر کہا —
"تو پھر گویا یہ پوچھوں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے یا نہیں ؟" میں نے
ان کو حیران کرنے کے لیے جلدی سے کہا — "جی" ! انھوں نے
گھبراہٹ میں کہا ۔ "جی کیا" ؟ میں نے کہا ۔ "جی ہاں پوچھیے" ۔ انھوں نے
کہا — "پوچھا تو" ! میں نے کہا — "کیا پوچھا" ؟ ۔ انھوں نے ٹھنڈی
سانس لیکر جواب دیا — "کچھ نہیں" — میں نے کہا ۔ "جی نہیں ! آپ کو
بتانا ہوگا کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں" ؟ وہ یہ جملے سنکر
کچھ کھوئے گئے ۔ انکا دماغ پریشان ہوگیا ۔ انھوں نے اپنے سنبھالتے
ہوئے کہا — "میں" ؟ میں نے جلدی سے کہا ۔ "جی ہاں آپ" !
انھوں نے کہا — "یعنی" ؟ میں نے کہا — "یہی کہ آپ مجھ سے محبت
کرتے ہیں یا نہیں" ؟ انھوں نے کہا — "مگر یہ تو میں آپ سے پوچھتا
تھا" ۔ میں نے جلدی سے کہا — "بس یہی میں آپ سے پوچھتی ہوں" ۔
انھوں نے افسردہ خاطر ہو کر کہا — "اچھا میں کچھ نہیں پوچھتا" —

ملہ نے تیز ہو کر کہا۔ "مگر میں تو پوچھتی ہوں"! انھوں نے کمزور لہجہ میں کہا۔ "آپ کیوں پوچھتی ہیں؟" میں نے کہا "آپ کیوں پوچھتے تھے۔" انھوں نے بے اختیار ہو کر کہا۔ "قلب حزیں کو تسکین دینے کے لیے"! میں نے گہرے جذبات کے ساتھ کہا۔ "تو بس میں بھی اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے پوچھ رہی ہوں"۔ انھوں نے عالم بے بسی میں مگر مسرت کے لہجہ میں پوچھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟" میں نے طمانیت اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "جی ہاں سچ ہے"! یہ جملہ سنکر انھوں نے میرے چہرے کو بغور دیکھا اور صداقت کے آثار ہویدا پاکر خوش ہو گئے اور ان کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا۔ اور قلبی سکون اور پنہاں سرور کے ساتھ انھوں نے فرمایا۔ "اب میں کچھ نہیں پوچھتا"۔ میں نے پھر مسکرا کر کہا۔ "مگر میں تو پوچھتی ہوں" انھوں نے مردانہ شوخی کے ساتھ کہا۔ "اب میں کچھ نہیں بتاتا"۔ میں نے اٹھلا کر کہا۔ "تو میں بھی اب کچھ نہیں پوچھنا چاہتی"! انھوں نے مردانہ تمکنت سے کہا۔ "تم پوچھتے۔ ہمیں تو جواب ملگیا" ——— میں نے چمک کر کہا۔ "مجھے بھی جواب ملگیا ہے"۔ انھوں نے ستم ظریفی سے کہا۔ "مگر کہیں صاف تو نہیں ہے؟" میں نے اکڑ کر قدرے بگڑ کر کہا۔ "وہ تو صاف صاف، صاف! نہیں تھا مگر میں کہے دیتی ہوں کہ میرا صاف جواب ہے" ——— اس جملے کو سنکر انھوں نے قہقہہ لگایا۔ اور خدا جانے کیا سوجھی کہ مجھے اٹھا کر گود میں لیلیا۔ اور بغیر پیار کیے ہوئے لڑھکا دیا۔ اور فرمانے لگے

لیلیٰ! تم بڑی طرار ہو۔ ستم ظریف ہو۔۔

میں گر کر سنبھلی۔ سنبھلکر بیٹھی اور اس گرانے والے کو دیکھنے لگی۔

اور ان جملوں کو سنکر اور بھی تڑپ اُٹھی ــــــــــــ

میرا جی چاہتا تھا کہ یہ پٹکنے والا ۔ مجھے اسی طرح گود میں سے لیکر لڑھکاتا رہے۔ میں گرتی رہوں۔ چوٹ بھی لگتی رہے۔ لگتی رہے۔ وقت آئے کہ زیادہ چوٹ آجائے اور پھر اس کی مردانہ ہمدردی مجھ کو اپنی محبت۔ بھری آغوش میں لیلے ــــــــــــ چھاتی سے لگالے اور پھر کبھی جدا نہ کرے!

کچھ دیر کے لطیف سکوت کے بعد انھوں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔ میں نے ان جملوں کی صداقت پر شک کیا اور ان کی طرف جائزہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا اور مزید اطمینان کے لیے پوچھا۔ "کیا سچ فرما رہے ہیں؟"۔ انھوں نے انتہائی متانت کے ساتھ کہا "ہاں یہ ایک حقیقت ہے"۔ میں نے کہا۔ "مگر میں تو طوائف ہوں"۔ انھوں نے فرمایا "نہیں تم طوائف نہیں ہو"۔ میں نے کہا "مگر دنیا تو مجھے طوائف کہتی ہے"! انھوں نے مستحکم انداز میں کہا۔ "کہنے دو! میں تم کو۔ تمہارے دل کو۔ طوائف نہیں سمجھتا"۔ میں نے پھر پوچھا۔ "مگر مجھ سے آپ شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" انھوں نے انتہائی

اطمینان اور سادگی کے ساتھ کہا۔ "لیلیٰ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ وہ محبت جس کو میں نے چھپانے دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کی۔ دوستوں نے مجھے سمجھایا۔ میری اس محبت پر دوستوں کے مباحثے ہوئے۔ میں خود بھی ابتدا ئیہ سمجھتا رہا کہ یہ عشق نہیں ہے بلکہ محض عیاشانہ لگاؤ ہے لیکن ؂

چھاگیا لیجئے ھکر حسن ہستی پر
نقل الفت کو لگایا تھا ذرا سا دل میں

میری بے بسی۔ میری حرکات وسکنات۔ تخلیہ کی کیفیات۔ مفارقت کے تخیلات۔ نظام عصبی پر چھا جانے والے پاکیزہ تاثرات نے مجھے یقین دلایا کہ یہ محبت ہے۔ اور وزنی محبت! یہی وجہ ہے کہ باوجود تمھارے پیشہ کے نذر نے ادا کرنے اور تخلیہ حاصل ہونیکے بھی اپنے دل کے اندر ایک غیر محسوس خیال کو جاگزین پاتا رہا جس نے ناجائز مباشرت کی طرف کبھی اقدام نہ کرنے دیا —— میں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اُن کے خیالات کی پذیرائی کی میرا دل خوشی سے لبریز تھا۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے جن کو میں بمشکل ضبط کر رہی تھی —— میں نے اپنی زنانہ کمزور آواز میں ارادے کی مضبوطی کے ساتھ کہا —— "میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور شادی کے لیے تیار ہوں" ۔ ان الفاظ میں خدا جانے کیا جادو تھا۔ کہ ہم دونوں مسحور اور مبہوت ہو گئے۔ ہمارے خیالات نے پوشیدہ پرواز کی اور کتخدائی کے سہاؤنے نظارے میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔

اور ہم دونوں کی آنکھوں سے اس خیال کے خیر مقدم کے لیے آنسوؤں کے چند موتی ٹپک پڑے! ــــ

اب انھوں نے کی بیتابی کا اظہار کیا۔ اور جلد آنے کا وعدہ کیا۔ میں نے بھی ان کو اجازت دیدی اور وہ چلے گئے ۔ مجھ کو ان کے جانے کا آج کوئی رنج نہ ہوا۔ کیونکہ میں اپنی تنہائی میں شادی کے اہم مسئلہ پر غور وخوض کرنا چاہتی تھی

وہ چلے گئے ۔ میں چپ ہو گئی ــــ بہت دیر تک دماغ نے کچھ کام نہ کیا ۔ لیکن پھر خیالات کا طوفان اُمڈا اور میرے دل ودماغ پر چھا گیا ۔ کبھی میں ڈر گئی ۔ سہم گئی کبھی اسقدر خوش ہوئی کہ میری باچھیں کھل گئیں میں اُن خیالات کو یہاں کیسے لکھوں ۔ بڑی مشکل ہے ــــ میری قلبی کمزوریاں ۔ میرے تردوات ۔ میرے وسوسے میرے اندیشے مجھکو جادۂ مستقیم سے ہٹا رہے تھے اور کوئی غیر محسوس قوت ۔ کوئی نا معلوم جذبہ اور حقیقی محبت کے روح افزا تخیلات اور کسی کی خوبصورت شکل وصورت مجھ کو راہ راست پر آجانے کی ترغیب دے رہی تھی۔ زندگی کا طولانی سفر! ایک کی ہمراہی میں! محبت کے دامن میں! ــ نیکی کی آغوش میں! سماج کی نکتہ چینی میں طے کرنا! ـــــ کسقدر عجیب معلوم ہو رہا تھا مجھے یہ خیال! ـــ

آخر ش میری سوچ بچار سب بیکار گئی ۔ جبکہ کسی میٹھے میٹھے درد نے بیتاب کر دیا اور میں نرسی کو جلد دیکھنے کے لیے مچلنے لگی! ـــ

خدا کی پناہ۔!! وہ دس بجے شب کو واپس آئے۔ مگر انتہائی مزین وفاخرہ لباس میں۔ خوشبو میں بسے ہوئے اُن کا چہرہ شگفتہ تھا۔ آنکھوں سے محبت کا نور برس رہا تھا۔ اُن کا سینہ گہرے سانس لینے کی وجہ سے اُٹھتا اور بیٹھتا ہوا۔ معلوم ہو رہا تھا ——— مجھے دیکھے کہ وہ آئے۔ مگر میں اُٹھ نہ سکی ۔ سلام نہ کر سکی نگاہ تک نہ ملا سکی حالانکہ انکی آمد پر ہمیشہ اُٹھکر تسلیم بجالاتی تھی۔ اور اس کے لیے بدنام بھی تھی۔ مگر آج خدا جانے کس چیز نے پاؤں پکڑ لیے۔ کلیجہ پکڑ لیا۔ ہمت شکست کر دی کہ نہ اُٹھ سکی۔ جو مصرعہ گا رہی تھی وہ بھی بھول گئی۔ ایسی بھولی کہ گا ہی نہ سکی ——— اُن کے ساتھ سردار صاحب اور مرزا صاحب اور ایک نئے صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ وہ کیا کہتے ہوں گے میں نے کسی کو بھی آداب عرض نہیں کیا ——— مجھے وہ اس وقت نوشہ معلوم ہو رہے تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ اُن کے سر پر سہرا نہ تھا۔ اے کاش! سماج انھیں اس کی اجازت دیتا! وہ ضرور باندھکر آتے۔ وہ خوش تھے۔ بیحد خوش!

میں انھیں دیکھ کر شرما رہی تھی زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ میرے اعضا سکڑے جا رہے تھے۔ تعجب! بیحد تعجب! کہ میں نے ساڑی کے آنچل کو سر پر رکھا اور ذرا پیشانی پر کھینچا ——— آہ! زیادہ آگے نہ بڑھا سکی! ——— کسقدر رنگین فطرت ہے دولہا کو دیکھکر شرمانا۔ لجانا۔ آنچل ڈالنا! ———

ستم ظریفی دیکھئے کہ لوگوں نے گانے کو جاری رکھنے کی بار بار فرمائش کی۔

جی میں آیا کہ سارنگی کھینچ ماروں کمبختوں کے سر پر! مگر سوچا کہ ان
کا کیا قصور! وہ کیا جانیں! میں نے اب سر کے درد کا بہانہ کیا۔
اور گانے سے انکار کر دیا۔ اس پر اہل محفل برافروختہ ہوئے۔ آخرش
ایک صاحب نے کہہ ہی دیا ـــــــــ "وہ میر صاحب! اچھے
تشریف لائے کہ ہمارا مزہ ہی کرکرا کر دیا"! اس جملے سے میر صاحب
قدرے خجل ہوئے اور فرما بیٹھے ـ "لیلیٰ! تم گاتی کیوں نہیں؟" اب
کہئے! انھیں کیا سوجھی تھی اور کیسی بے وقت۔! ان کو معلوم تو تھا کہ
مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ مگر کہہ گئے۔ رو میں کہہ گئے۔ میں نے
جواب دیا۔ "آپ کچھ سننا چاہتے ہیں"؟ سردار صاحب کہہ اٹھے
جھکنے والے تھے۔ انھوں نے سہارا دیا۔ "ہاں لیلیٰ! ان کو ایسی
ٹھمری سناؤ کہ مزاج بحال ہو جائے"۔ میری گردن ابھی تک جھکی
ہوئی تھی۔ مگر اس جملہ نے ذرا ہمت پیدا کی اور میں نے مرزا صاحب
کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سمجھے اور انھوں نے کہا۔ "جب کسی کے
سر میں درد ہے تو مسکرائی۔ اب میر صاحب کو بھی ہوش آیا۔ اور
کہنے لگے۔ "ہاں جب ایسا ہے تو مت گائیے۔ مگر آپ کے سر میں
درد کیوں ہے؟ سمجھیے۔ ان کو بتلائیے کہ سر میں درد کیوں ہے۔
طوائف کے سر کے درد کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے؟ وہ تو بہانہ ہے
جب ہو جاتا ہے جان بچانے کا سستا نسخہ ہے۔ مگر ان کو کون
سمجھائے ـ سردار صاحب نے فرمایا" ـ سر میں درد سے گویا نے
ضرور ہو جاتا ہے۔ اتنا ہم بھی جانتے ہیں"۔ اس جملہ پر سوائے میر

اور میر صاحب کے سب ہنس پڑے ۔ میری جان بچ گئی ۔ لوگ جانے لگے۔ میں خوش ہونے لگی ۔ مگر میری والدہ اور خالہ نے قہر آلود نگاہیں مجھ پر ڈالیں ۔ جس سے میں سہم گئی ۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ۔ یعنی جبکہ سردار صاحب نے میری والدہ کو ہمارے سامنے ہی اپنی طرف کھینچ کر کندھے سے کندھا ملایا اور کچھ نوٹ ان کی نذر کر دیئے تو وہ خوش ہو گئیں ۔ مجھ کو بھی سرزنش سے معاف کر دیا گیا ۔ ـــــــ

ـــــــ میں بہانہ کو نباہنے کے لیے قالین پر لیٹ گئی ۔ اور مرزا صاحب میرے قریب آکر بیٹھ گئے ۔ اور انھوں نے ـــــــ بڑا تعجب ہے ! ـــــــ کہ میرا سر دبانا شروع کر دیا جس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ۔

ـــــــــــــــ

الغرض باہر کے دروازے بند کر دیے گئے ۔ اور کھانا نکالا گیا ۔ بازار سے بجد تکلف سامان خورد و نوش مع خواکہات منگایا گیا ۔ اور خوب سیر ہو کر کھایا گیا ۔ تماشہ شروع ہوا ـــــــ ختم ہوا ـــــــ والدہ خالہ وغیرہ چلی گئیں ۔ اور مرزا ، اچھے مرزا نے مجھے سے دبی ہوئی پیاری آواز میں خطاب کیا ـــــــ " بھابھی جان دیور کا سلام قبول فرمائیے " اس معنی خیز جملہ کو سنکر میں اتنا شرمائی کہ گردن جھک گئی ۔ مگر دل ہی دل میں اسقدر مسرور ہوئی کہ میں نے خون کی فراوان روانی کو اپنے چہرے پر محسوس کیا ۔ اب میری پیشانی سے سردار صاحب کا ہاتھ مس ہوا اور انھوں نے میرے سر کو اوپر اٹھا دیا ۔ اور

کہا ــــ "ہمارے تو دو رشتے ہیں۔ ہم جیٹھ بھی ہوئے اور ......" مرزا صاحب نے جملہ پورا کیا۔" اور میر صاحب کے خسر بھی" اس جملے پر سب ہنس پڑے۔ پھر سردار صاحب شفقت کے ساتھ بولے ــــ "لیلیٰ! کچھ مٹھائی تو کھلاؤ یا چپ چپ رہی بس" مرزا صاحب نے کہا۔" اتنا کھایا مگر سردار صاحب کا پیٹ کیا ہی عمر عیار کی زنبیل ہے۔ بھرتا ہی نہیں" ــ میر صاحب نے کہا ــ "بھرتا تو ہے مگر ہوا کھاکر۔ مار کھاکر گھونسے کھاکر ـ اور چند جھوٹی قسمیں کھاکر" سب مسکرائے اور ہنسے ــ

ایک بجے جب میں اپنے کمرے کی طرف میر صاحب کے ساتھ جانے لگی تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں حجلۂ عروسی میں جا رہی ہوں اور میرا نوشہ ـ پیارا دولہا ـ میرا سرتاج میرے ساتھ ہے ـ میرے پاؤں بھاری ہو گئے ـ میں نہ چل سکی ـ اخرش میر صاحب کو سہارا دینا پڑا ـ اور وہ مجھے سنبھالے ہوئے ـ کمرے میں پہنچ گئے ـ جہاں جاتے ہی میں نے اپنا منہ اتنا زور سے چھپایا کہ میر صاحب بدقت تمام اس کو کھول سکے

خلوت میں محبت کے حقیقی جذبات کی بے پناہ ابتدا احترازا کیا ہے ـ جس کو جذبات حیوانی کچل ڈالتے اور پامال کرنے میں بیحد و بے قیاس لطف لیتے ہیں! ــ

میں اُن کو آج ایک بالکل نیا انسان متصور کر رہی تھی اور شاید ان کے لیے بھی میں نئی عورت محسوس ہو رہی تھی۔ آج میرے میر صاحب میں سب باتیں نئی تھیں۔ وہ شرم سے کوسوں دور۔ جوش و غرور میں ڈوبے ہوئے اعتماد کی دولت کو سینہ میں لیے ہوئے متاعِ حسن کے خزانہ پر جارحانہ قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ اُن کی ہر حرکت دلاویز اور کیف زا تھی۔ ان کا ہر لفظ مسرت میں ڈوبا ہوا اور راحت انگیز تھا۔ اُن کی ہر نگاہ دعوتِ ہم آغوشی دے رہی تھی۔ ان کا ہر طریقہ نیا۔ جانفواز۔ اور حیات بخش تھا۔ اُن کی ہر مردانہ ادا میرے لیے خوشبوؤں کا ایک سمندر تھی۔ میں آج مجہول مطلق تھی۔ اپنا جسم ان کے آغوش کو سونپ چکی تھی۔ شرابِ محبت کے دور پر دور چلنے کے بعد ہم دونو نشہ میں چور ہو گئے۔ میں گرتی تھی وہ سنبھالتے تھے ——————

—————— (شاید فطرتِ نسائی کی شان یہی ہے) ——————

اب مئے محبت کے خم کے خم لنڈھانے کے بعد تلچھٹ تک ختم کرنیکے بعد۔ میرے میر صاحب کو نئی سوجھی اور شراب سے شربت پر اتر آئے۔ مگر شربت میں وہ مزہ کہاں۔ جو شراب میں ہے۔ میں نے شرماتے ہوئے پوچھا بھی۔ تو یہ کہکر ٹال گئے کہ اتصال جنسی عین اقتضائے محبت ہے۔ لیجئے! —— اب کیا کہئے! میں نے بھی پھر پوچھ ہی لیا کہ —————— آپ نے بوتل کو ہاتھ میں کئی کئی بار لیکر بھی شربت ابتک کیوں نہ پیا تھا؟ —— کیا غضب کا جواب دیا ہے۔ میر صاحب نے! فرمایا۔ "اس لیے کہ میں پیاسا نہ تھا" میں بیحد مسرور ہوئی اور بولی۔ "کیا اور بھی

کوئی بات ہے"۔ انہوں نے فرمایا۔" ہاں ہے اور وہ یہ ہے کہ شربت روا نہ تھا اور پلانے والا بھی سچے دل سے روادار نہ تھا"۔ اسقدر اچھے تھے یہ جملے! میں نے سنے اور شربت وصل کے خمار کے بعد ——— خدا جانے کیوں؟ ———

میں مسہری سے اُٹھ کر نیچے چھپ گئی۔ کچھ ایسی شرمائی۔ کچھ ایسی شرمائی۔ کچھ ایسی لجائی۔ کہ باوجود ان کے اصرار کے بھی میں۔ مسہری کے نیچے سے نہ نکل سکی ———

انہوں نے مجبور ہو کر پلنگ کو اٹھا دیا اور مجھے پکڑ لیا۔ کھینچا اور اٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔ بھینچا۔ اور اس طرح میری اس محبت بھری حیا کو دور کر دیا۔ سب کچھ در پردہ و بے پردہ ہو گیا۔ ہم دونوں کے دل ——— محبت بھرے دل ——— داد عیش دیتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح کے چار بج گئے ——— میں خستہ و چور ہو گئی ——— پہلے حیا نے دبایا تھا اب نیند نے آن دبایا۔ اور میں نے لمنت کہا۔ —"اگر اجازت ہو تو میں دس پندرہ منٹ کے لیے سو جاؤں ——— میرا سر بھاری ہو گیا ہے"۔ انہوں نے حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور کچھ نہ بولے۔ میں نے پھر عرض کیا۔" زیادہ نہیں محض پندرہ منٹ کے لیے سونا چاہتی ہوں۔ بیحد تھک گئی ہوں"۔ انھوں نے با دل نخواستہ اجازت دیدی اور میں تکیہ پر سر رکھتے ہی سو گئی ———

خدا جانے مجھے سوتے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہو گی کہ میں نے رونے اور آہوں کی آواز کو سنا۔ لیکن اس کو نقص سماعت پر محمول کر کے پھر سو گئی۔ اب ایک جگر خراش رونے کی چیخ نے مجھے چونکا دیا اور میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ ان کو روتا دیکھکر بیچین ہو گئی۔ وہ مسہری پر بیٹھے تھے کمر بھی دیوار سے لگی تھی ایک ہاتھ سے پیشانی پکڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے آنسوں، سینہ سے آہ اور منہ سے رونے کی دبی ہوئی چیخیں نکل رہی تھیں میں نے لاکھ پوچھا لاکھ جھنجھوڑا۔ منت سماجت کی پوچھا۔ مگر اُن کی خدا جانے کیا حالت تھی کہ نہ چپ ہوئے اور نہ بولے ——————

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو میری موجودگی کا بھی احساس نہیں ہے اب میں بیحد پریشان ہو گئی۔ اور سمجھ نہ سکی کہ یہ کونسی طاقت ہے جو ایک مرد باہمت کو ایک عورت کے سامنے رونے پر مجبور کر رہی ہے —————— میں نے بہت کچھ سوچا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ ان کو قسمیں تک دیں۔ مگر کام نہ چلا۔ آخرش میں نے اپنی چوٹی کے بالوں کو جلدی جلدی کھولا —— مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے لانبے بالوں سے بیحد محبت کرتے ہیں جس کا وہ صدہا بار اظہار بھی کر چکے تھے۔ میری آنکھیں بھی ان کو پسند تھیں۔ وہ ایسا اکثر کہا کرتے تھے —————— بالوں کو کھولکر پھیلا کر میں اُن کے سامنے بیٹھ گئی اور میں نے اپنے بالوں کو اُن کے منہ پر گردن پر بازوؤں پر بچھا ور کر دیے —————— کچھ

کہنا چاہا۔ مگر میرا گلا گھٹ گیا اور میں بھی رونے لگی ——————

خدا جانے کون تھی وہ طاقت جس نے مجھے بھی دیوانہ وار رونے پر مجبور کردیا۔ اب کیا تھا ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ——————

کچھ دیر کے بعد ترشح کم ہونے پر میں نے گھٹاؤں کے سایہ میں ہی کہا —————— پیارے میر صاحب! خدارا نہ روئیے۔

دیکھئے۔ وہ بال جن کو آپ پسند کرتے ہیں۔ آپ پر نثار کر رہی ہوں۔ جن آنکھوں پر آپ جان دیتے ہیں۔ وہ آپ کی آنکھوں کی طرف منت سے دیکھ رہی ہیں اور جس گندہ جسم سے آپ محبت کرتے ہیں۔ وہ آپ کے روبرو قربان ہونے کو حاضر ہے۔ جس دل کی آپ قدر کرتے ہیں۔ وہ اس وقت تڑپ رہا ہے ——————

خدارا نہ روئیے! —— نہ روئیے —— نہ روئیے! ——————

میں نے ان الفاظ کو رقت آمیز! بھرائے ہوئے لہجے میں بمشکل تمام ہچکیاں لیتے ہوئے ادا کیا۔ ارے ان پر اثر ہوا شکر خدا وہ ہوش میں آئے اب ان کی حالت اسقدر قابل رحم تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتی میرا جی چاہتا تھا کہ میں ان کے دل میں چین اور سکون پیدا کرنے کے لیے اپنی ہستی کو فنا کر دوں ——————

دونوں طرف ایک گہری خاموشی طاری تھا! ——————

جب ذرا سکون ہوا تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "آپ اسقدر بےچین کیوں ہو گئے تھے؟" متین لہجہ میں انھوں نے جواب دیا۔

مجھے آپ کی آنکھیں بند ہونے سے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میری دنیا تاریک ہو گئی۔ میں نے برداشت کیا ــــــ مگر پھر خیال آیا کہ اگر یہ خوبصورت آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں تو میں کیا کروں گا۔ اس خیال پر پہنچتے ہی خدا جانے کیا ہوا۔ کہ میں رونے لگا اور پھر مجھے ایک دھندلا سا خیال ہے کہ میں کسی صحرا میں چیخیں مار مار کر رہا ہوں اور چلا رہا ہوں ــــــــــــ شاید آپ کے بکھرے ہوئے بالوں کی بکھری ہوئی خوشبو۔ آپ کے الفاظ۔ اور آپ کے پیارے جذبات تھے جو مجھے ہوش میں لے آئے۔ مجھے تکلیف وہ یقین ہے کہ آپ کو خواہ مخواہ بڑا صدمہ اٹھانا پڑا جس کے لیے شرمندہ ہوں "

میری زبان سے معاً ــــــ "میرا دیوانہ" ــــــ نکلا اور میں انکے آغوش میں گر گئی اور صحرائے وحشت کی وسعت اور پہنائیوں کا اندازہ

میں یہاں یہ ضرور لکھدوں کہ عورت کے لیے دنیا میں بہترین مسرت بخش شئے اشک محبت ہے۔ یہی عورت کی فتح ہے اور یہی عورت کی شکست!

ہاں! یہی ہتھیار ہے اور یہی مار! ــــــــــــ

بڑی خوش نصیب ہے وہ عورت جس کے لیے مردانہ دو آنسو بھی صداقت ریز خونِ جگر سے بنکر گوشہ ہائے چشم سے نکلے ہوں ــــــ اور بہت خوش نصیب ہے وہ مرد جس کے لیے نسوانی کلیجہ کے سمندر سے اُبل کر آنسوؤں کے چشمے بہ نکلے ہوں ــــــــــــ

آنسو جس کی ابتدا گہرے جذبات اور جگر سوزی سے ہوتی ہے

جذبات فطرت کا بہترین اور شدید ترین طبعی مظاہرہ ہے آنسو بے انتہا قیمتی شے ہے جس سے بڑھکر قلب و جگر کو حقیقی راحت پہنچانے والی اور کوئی چیز نہیں! آنسو سے زیادہ باوفا۔ آنسو سے زیادہ ساتھ دینے والا دوست! سچا ہمدرد اور مونس! ــــ اور عین موقعہ پر مدد کرنے والا رفیق! اور کوئی نہیں ہے۔ غم و الم کی انتہائی بھٹیوں میں۔ ہجر و فراق کی تنہائیوں میں۔ افلاس و غربت کی گھڑیوں میں۔ ظلم و ستم کی گھٹاؤں میں۔ حتیٰ کہ راحت و مسرت کی انتہائی سرشاریوں میں اور جذبات لطیف کی گہرائیوں میں۔ آنسو ہی کارفرمائی کرتا ہے۔ آنسو ہی ہے جو زندگی کے سمندر کے مدوجزر میں حقیقی تسکین کی لہر دوڑاتا ہے۔ اور طبع میں ہمواری۔ قلب میں اطمینان پیدا کرتا ہے۔ اور انسانی دل و دماغ سے قنوطیت اور یاس کی گھنگھور گھٹاؤں کو سرچشمۂ چشم سے قطرہائے خونیں کی بارش برساکر مطلع رجائیت کو صاف اور روشن کرتا ہے۔ انھیں آنسوؤں سے مزرعۂ حیات کی آبیاری ہوتی ہے۔ آنسوؤں کی جھڑی! اور سیل اشک ہی کدورت اور غبار دل کو صاف کر کے میدانِ رنج و محن میں استعدادِ نمو پیدا کرتا ہے۔ آنسوؤں کے قطرے ہی اشجار بار در کی تخم ریزی کرتے ہیں آنسو ہی صدف دل میں لولو اور مرجان پیدا کرتے ہیں۔ اور آنسو بہانے والا ہی موتی رولتا ہے اور کبھی موتیوں میں بھی تولا جاتا ہے! آنسو دریائے رحمت کو جوش میں لاتے ہیں۔ شفاعت کرتے ہیں نجات ابدی کا باعث

ہوتے ہیں۔ شہدائے کربلا کے لیے رونا کون نہیں جانتا کہ دین و دنیا میں کتنی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بقول اقبال۔ آنسو خدا کو بھی مرغوب ہیں۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
آنسو جو گر گئے تھے میر انفعال سے } تصرف

علاوہ بریں حضرت غالب اس شعر کو ؎

بسکہ روکا سینہ میں لیکن وہ ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں } غالب

یوں فرماتے تو کتنا اچھا ہوتا ؎

قطرہائے رشک باہم بن گئے تار رفو
میری آنکھیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں } عطا

۲۵/مارچ ۱۹۳۰ء

گذشتہ ہفتہ اپنی معمولی نشاط بزی اور خمار خیزی کے ساتھ گزر گیا جس میں رجائیت کی ضوفشانی اور قنوطیت کی روح فرسائی دونوں شامل حال رہیں۔ ان کا اتصال اور افتراق۔ زندگی کے خیال سمندر میں ہمیشہ مد و جزر پیدا کرتا رہتا ہے۔ جس سے تنوع فطرت کو سکون ہوتا ہے۔

حالانکہ انسانی مادی دماغ زندگی کی تصویر کے غیر دلکش رخ سے ہمیشہ نالاں اور شاکی رہتا ہے۔ لیکن زندگی کی حقیقی راحت کا احساس۔ اور طلب راسخ کی۔ حیات کی کاوشوں میں اُمنگ اور ترنگ اسی انفصال اور افتراق سے پیدا ہوتی ہے۔ جو عین اقتضائے بشریت۔ مداوائے حسرت یا تشکیل طمانیت ہے۔

۲۵ مارچ کی شام انتہائی بے ہنگام تھی۔ سہ پہر سے ایک بڑے میاں میری والدہ سے کانا پھوسی کر کے مطمئن ہو بیٹھے تھے جس سے مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ لیکن غنیمت یہ تھا کہ ان کی نظریں مجھ پر جارحانہ نہ تھیں۔ بلکہ عاجزانہ تھیں۔ میں نے سمجھنا چاہا۔ مگر نہ سمجھ سکی حالانکہ ہمیشہ سمجھ جایا کرتی تھی۔ لیکن آج حیران تھی کہ کیوں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔ آخرش عقدہ کھلا۔ اور والدہ کی گفتگو سے بعید معلوم ہوا۔ جو بتلایا گیا کہ میں نواب شہاب الدین کے یہاں مدعو ہوں اور مجھے ان کے مکان پر جانا ہوگا۔ میں نے سختی کے ساتھ انکار کیا۔ مگر شنوائی نہ ہوئی والدہ اور خالہ کی ترغیب اور ڈانٹ نے راضی ہونے پر مجبور کیا اور میں کچھ سٹ پٹا کر چلی ہی گئی۔ نواب صاحب تیس بتیس سال کے جوشیلے تھے بانکپن کے علاوہ تمکنت مزاج میں بہت تھی۔ ابتدائی گفتگو کے آداب الفاظ حقہ کی نے چبا گئی۔ تمکنانہ لہجہ کی کرختگی۔ کچھ تتول کی آہستہ روی آڑے آئی۔ کچھ سمجھی اور کچھ نہ سمجھی۔ ایسے بلانے والے حضرات کو یقین پہلے سے ہوتا ہے۔ کہ ہم ایک جانور کو خرید کر پاس بلا رہے ہیں جو زبان رکھتا ہے۔ مگر بلا نہیں سکتا۔ جو ہمارے اشاروں پر

ناچے گا۔ اور ہماری بے تکی۔ ادھوری اور بے ربط گفتگو کو سمجھنے کے لیے سر کھپائیگا

شومیٔ قسمت کہ میں نہ تو کوشش کر سکی اور نہ پورا مفہوم سمجھ سکی میں نے سازندوں کو ساز ملانے کے لیے اشارہ کر دیا اور نواب صاحب چراغ پا ہوکر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور نہ آئے طبیعت میری بھی عجیب ہے! ــــ ان کی غیر موجودگی ہی میں میں نے گانا شروع کر دیا۔ سازندوں نے منع بھی کیا۔ مگر میں نے ان کو ڈانٹ دیا۔ میری تانیں دیواروں سے ٹکرانے لگی ساز پھڑ پھڑایا۔ میں بے سُری ہو گئی۔ مگر خدا جانے مجھے کیا سوجھی تھی کہ اور زور سے گانے لگی۔ اور گاتی ہی رہی ــــــــــ نواب صاحب نہ آنا تھا نہ آئے ــــــ آخر کار بڑے میاں تشریف لائے اور کہنے لگے "حکم ہوا ہے کہ گانا بند کردو۔" میں نے پوچھا "کیوں!" بڑے میاں نے کہا "ہمارے نواب صاحب گانا سننے کے زیادہ شوقین نہیں ہیں"۔ حالانکہ مجھے آگے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ مگر میں نے بڑے میاں سے پوچھ ہی لیا "اور کاہے کے شوقین ہیں؟ بڑے میاں کھسیانے گئے۔ سر کھجانے لگے اور اپنے بھدے دانتوں کو باہر نکال کر ہنس دئے۔ اب مجھے غصہ آیا اور میں نے سازندوں سے ساز بند کر کے چلنے کے لیے کہا۔ بڑے میاں بھاگے ہوئے گئے اور معہ نواب صاحب جلد آگئے۔ میری جلی کٹی گفتگو سے اور نیازانہ رویہ سے، نواب صاحب رنجشہ خطمی ہو گئے۔ اور سب نوابی بھول گئے اب خوشامد پر اتر آئے۔ میں نے والدہ کے ڈر سے واپس جانے کا

ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ سمجھے کہ رام ہو گئی۔ پھر کھنچ گئے۔ میں بھی کچھ پسیج گئی کیونکہ مجھے ان سے کافی روپیہ کھینچنا تھا ـــــــــــــــــــــــ

شب کے دو بجے مجھے وحشت ہوئی میں نے ان کو ہلا ہلا کر کئی بار باہر جانے کی اجازت مانگی مگر وہ غین تھے کافی پی گئے تھے۔ خراٹوں کی آواز سے میں اور مایوس ہو گئی اور کمرے سے نکل کھڑی ہوئی مکان بھول بھلیاں تھا۔ کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔ خدا جانے کن جذبات کے تحت۔ یاد ہو کہ میں دوسرے کمروں میں ہوتی۔ ایک ایسے ہال (بڑے کمرہ) میں پہنچ گئی جہاں مجھے نئی آوازیں سنائی دیں میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ایک آواز عورت کی ہے اور دوسری مرد کی ـــــــــــ

مجھے نواب صاحب پر بیحد غصہ آیا اور کچھ تعجب بھی ہوا کہ اسقدر جلد وہ ہوش میں کیسے آ گئے اور یہ نئی عورت کہاں سے آ گئی اب میں نے پھر غور کیا اور وہیں آوازوں کو کان لگا کر سنا۔ یہ معلوم کر کے تعجب اور خوف پیدا ہونے لگا کہ وہ آواز تو نواب صاحب کی آواز سے ملتی جلتی نہ تھی اب مجھے بے تکی سوجھی اور میں ملحقہ کمرے کے درواز پر پہنچ گئی۔ جہاں سے گفتگو صاف سمجھ میں آتی تھی۔ جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نواب صاحب کے کوئی دوست اپنے کسی معشوق کو لئے یہاں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اس شخص کی آوازیں بلا کی کشش تھی۔ انداز گفتگو بیحد موثر تھا۔ لب ولہجہ جذبات میں دبا ہوا تھا۔ برخلاف اس کے عورت کی نحیف آواز اور اس کے جوابی

سے ایک خاص قسم کی بے اطمینانی ۔ اور بے چینی کا رنگ لیے ہوئے تھے ۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عورت بھی کوئی میری سی طبیعت رکھتی ہے ۔ غرضکہ دونوں آوازوں نے اسقدر کشش پیدا کی کہ میرے دل میں اُن سے ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی ۔ یقیناً یہ میری خواہش بیجا اور بے وقت تھی ۔ مگر تھی اسقدر قوی کہ اس نے مجھ سے وہ کرایا ۔ اور اس نے مجھے وہ دکھلایا جو شائد میں کبھی نہ دیکھ سکتی تھی ۔ میں نے بہت چوری سے جھانکا ۔ مگر پکڑی گئی ۔ عورت کی خفیف چیخ اور مرد کی گھبرائی ہوئی گرفت سے زیادہ ہم ایک دوسرے کو دیکھنے نہ پائے تو پہلے ۔ اندازہ لگانے میں گہری خاموشی کے ساتھ مصروف رہے ۔ میں اُن سے وہ مجھ سے ڈر رہے تھے ! ۔ شاید میں کم اور وہ زیادہ ! ۔ آخر کار عورت نے مجھ سے سنبھلتے ہوئے پوچھا " تو کون ہے ؟ میں نے بھی اس سے اسی لہجہ میں پوچھا ۔

—— اور تو کون ہے ؟ ——

اب پھر خاموشی طاری ہوگئی ۔ مگر میں زیادہ سہم گئی ——

اور میں نے واپس جانے کا ارادہ کیا وہ آدمی بھی سہم کر مجھے چھوڑ چکا تھا ۔ میں لوٹی ۔ مگر میں جیسے ہی کمرے سے باہر آئی ۔ وہ عورت بھی باہر نکلی اور میرے سامنے محجوب و منفعل کھڑی ہوگئی ۔ وہ بیحد ہراساں تھی ۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اتنے میں مرد بھی باہر آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑا التجاعت اور محبت بھری نظر ولما سے دیکھا ۔ وہ مجھے پکڑ کر اندر لے آیا —— اور میں بھی ——

تعجب ہے ———— اندر چلی آئی ———— ہماری عزت
تمہارے ہاتھ ہے"! — یہ جملہ دونوں نے بیک وقت کہا جس سے
میں بے حد چونکی — چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس عورت نے کہا۔
"میں جان گئی ہوں کہ تم میرے شوہر کے پاس سے آ رہی ہو اور یہ بھی جانتی
ہوں کہ اب پھر تم اس کے پاس جاؤ گی ۔ مگر خدا کے لیے ہمارا راز فاش
نہ کرنا" ۔ ان جملوں نے تمام حقیقت مجھ پر آشکارا کر دی ۔ اور میں سمجھ گئی
کہ بیگم صاحبہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ ہیں ۔ پھر بھی میں نے پوچھا ۔
"بیگم صاحبہ ! مجھے اتنا تو بتلائیے ۔ کہ آپ کیوں ایسا کرتی ہیں؟" وہ
بولیں "۔ تم عورت ہو کر ایسا پوچھتی ہو ۔ مگر نہیں تم طوائف معلوم ہوتی
ہو ۔ اسی لیے نہیں سمجھ سکتیں کہ عورت ...."
وہ آگے کہنے سے رک گئیں ۔ میں نے فوراً کہا " ہاں ! مجھے بتلائیے
کہ ...." بیگم صاحبہ نے پھر شروع کیا " میرا شوہر روزانہ
تم جیسی عورتوں سے خلوت و جلوت میں مشغول رہتا ہے" — اب میں
نے اضافہ کیا ۔ " اور صبح شام شراب پیتا ہے" بیگم صاحبہ نے کہا ۔
"ہاں ! شراب ۔ عیاشی اور جوئے نے اس کو ایسا اندھا بنا رکھا ہے کہ
اس کو میری مطلق پروا نہیں آخر میں بھی عورت ہوں ۔ دل رکھتی ہوں ۔
خواہشات رکھتی ہوں ۔ مجبور ہوں ————" انہوں نے گہرا سانس
لیا اور پھر کہنا شروع کیا ——— " اسی لیے ان کے دھوکہ میں آ گئی ! کیا !
———— اور یہ گناہ جاری ہے" میں نے متانت کے ساتھ
کہا " لیکن اس گناہ کی تمام تر ذمہ داری آپ کے شوہر پر ہے یا آپ پر

ہے"؟ بیگم صاحبہ نے کہا۔ "نہیں یہ غلط ہے کہ محض تم اس کی ذمہ دار ہو۔ بلکہ تم جیسی سیکڑوں اس جہان خراب میں موجود ہیں"۔ اُس عیاش مرد نے پوچھا "اس وقت نواب صاحب کیا کر رہے ہیں"؟ میں نے جواب دیا۔ "انٹا غفیل ہیں! خوب پٹے ہوئے ہیں اور بے سدھ سو رہے ہیں"۔ اس نے پھر پوچھا۔ "تم اب پھر وہیں جاؤ گی"؟ میں نے اقرار کیا .... چند دل ہلا دینے والی باتیں اور بھی ہوئیں۔ جن کا لکھنا عبث ہے کچھ دیر کے بعد مرد نے بیگم صاحبہ کے گلے سے اتار کر ایک قیمتی نکلس (سونے کا زیور) مجھے دیا اور منت سے کہا۔ "خدا کیلئے [illegible] سے بھی ہماری ملاقات کا تذکرہ نہ کرنا" بیگم صاحبہ نے بھی تائید کی اور میں ـــ ہاں میں ـــ اس نکلس کو لیے ہوئے وہاں سے نکل آئی اور تلاش کرتی کرتی نا عاقبت اندیش نواب کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جو اب بھی خراٹے لے رہا تھا .... اس کو مطلق علم نہ تھا کہ اس کی بیوی محض اس کی عیاشی کی بدولت اسی حرکات میں ....

عیاشی کی بھی کیا شان ہے! اور عیاشوں کی کیا آن بان ہے! خدا کی پناہ! مگر مجھے یہ مان لینے میں ذرا بھی باک نہیں کہ طوائف کی ذات زیادہ حد تک ہر قسم کی خرافات۔ حادثات فطرت کے مذنات کی روح رواں ہوتی ہے۔

اس نکلس کو میں نے کچھ دانستہ کچھ غیر دانستہ طور پر پہن لیا۔ اور میں بھی سو گئی ——

نواب صاحب مجھ سے پہلے جاگ گئے اور مجھے اٹھا کر سب سے پہلے انھوں نے اس نکلس کے متعلق پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ "یہ میرا ہے"۔ انھوں نے کہا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب تم آئی تھیں تو تمھارے گلے میں یہ نکلس نہ تھا"۔ میں نے کہا "ہاں اس وقت یہ میرے پاندان میں تھا"۔ وہ اب کچھ نہ کہہ سکے

میں دن نکلنے سے کچھ پہلے ان سے رخصت ہو گئی اور مکان آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔ اور اس نکلس کے مستقبل پر غور کرنے لگی اچانک مجھے عدالت میں پیش ہونے کا خیال آیا۔ میں عالم تصور میں گرفتار ہو گئی۔ والدہ بھی پیش ہوئی۔ سب کے اظہار ہوئے اور کیا کیا ہوا۔ ان خیالات سے کرب اور بےچینی پیدا ہوئی ...... میں نے خود پر نفرین کی کہ میں اس نکلس کو کیوں لے آئی۔ عالم خیال میں ڈر رہی تھی کہ پھر کسی دماغی طاقت نے۔ اور شیطانی خیال نے بیگم صاحبہ کو اور مجھے عدالت کے کٹہرے میں بالمقابل کھڑا کر دیا۔ غریب بلکہ مظلوم بیگم کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ جج بنظر رحم اس کو دیکھ رہا تھا۔ عدالت کے ہال میں سیکڑوں آدمی جمع تھے جو نواب صاحب سے زیادہ عیاش تھے۔ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر جھانک رہے تھے اور اپنی اپنی بیویوں کے پوشیدہ افعال کا خیال اور

اور شکوک جائزہ لیکر ٹھہر ارہے تھے۔ جس سے بیحد محفوظ اور مسرور ہو رہی تھی۔ مجھ پر عدالت سوال پر سوال جرح پر جرح کر رہی تھی۔ اور نواب صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ کٹے جا رہے تھے۔ میری قوت متخیلہ نے میرے کانوں کو بیگم صاحبہ کے جرم کے انکار سے آشنا کرایا اور میں مجبور ہو گئی کہ اُس عیاش مرد کو بھی عدالت میں پیش کراؤں ————

تکلیف دہ کروٹ نے میری نگاہ کو عالم خیال سے نکال کر اس قیمتی نکلس کی طرف راغب کر دیا جو چمک رہا تھا۔ لیکن پھر دماغ نے خیالی مشین چلائی اور وہ عیاش مرد عدالت میں موجود ہو گیا۔ اس مرد کے اظہار اور نکلس مجھے خود دینے کے اقرار پر عدالت نے مجھے بری کر دیا۔ جس سے میری والدہ خالہ۔ ماموں ———— ہاں! میر صاحب عزیز صاحب وغیرہ وغیرہ بھی بیحد خوش ہوئے ————

لیکن عدالت کی ستم ظریفی! قانون کی کمزوری۔ یا کیا کہئے۔ کہ اس شخص کو سزا دی۔ نواب کو گرفتار تک نہ کیا۔ حالانکہ زنا کے مرتکب دونوں تھے۔ جرم دونوں تھے ———— اور مجھ کو کیوں رہا کیا؟۔ ———— تو بہر حال شریک جرم تھی! ———— خیال نے دوسری دنیا پیش کی ———— خدا جانے کیسے رونما ہوا اور کیا ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے نواب اس مرد کی طرف بڑھا اور اس کے سینہ میں چھرا بھونک دیا۔ وہ تڑپ کر مر رہا تھا۔ اور نواب ادھر اپنی بیوی کو طلاق طلاق۔ طلاق! کہہ رہا تھا۔ اور بیوی زار زار رو رہی تھی۔ عدالت کے حاضرین پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ اور میں خود کو

قریب المرگ محسوس کر رہی تھی ——— میں چونکی اور سوچنے لگی۔ دنیا اور اس کے رہنے والے کس قدر عجیب ہیں۔ اور انسان کے قوانین کتنے انوکھے ہیں ——— میں نے سوچا اور خیال میں دل سے مخاطب ہوئی" میں نے زنا کیا ——— روز کرتی ہوں ——— کوئی سزا نہیں دیتا! اس بیگم نے زنا کیا۔ معتوب ہی نہ ہوئی بلکہ طلاق کی سزا بھگتی اور ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار کر دی گئی۔ نواب نے زنا کیا ——— روز کرتا ہے۔ کوئی سزا نہیں دیتا ——— اس مرد نے زنا کیا۔ معتوب ہوا۔ سزا کا حکم بھی ہو گیا ——— اور جان سے بھی مارا گیا۔ اور مارا کس نے؟ جو خود زانی کے علاوہ شرابی بھی تھا۔ اور اپنی بیوی پر سب سے بڑا ظلم کرتا تھا! خونی۔ قاتل۔ ظالم۔ زانی! شرابی!

میں نے خیالی انتقام میں ارادہ قائم کیا کہ اب کبھی اگر نواب نے بلایا تو اس کو قتل کر ڈالوں گی ——— خواہ کچھ ہو جائے۔ مگر اس خیال کی باطنی طاقت نے مجھے ایک جھٹکا دیا اور میں سہم کر۔ اس عالم خیال سے باہر آ گئی ——— میری حریص نگاہوں نے دیکھا کہ نکلس اپنی جگہ پر اب بھی موجود ہے ——— میری طوائفانہ رگ کو تسکین ہونے لگی کہ اب مجھ سے اس نکلس کو کوئی نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اب مجھے یہ خیال آیا کہ نواب اپنی بیعزتی کے خیال سے دعویٰ کبھی دائر نہ کرے گا ———

مگر کیا میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ نواب نے اپنی بیگم سے اس نکلس کے متعلق کیا کیا پوچھا ہوگا اور مظلوم بیگم نے کیا کیا جواب دیا ہوگا۔ اور حشر کیا ہوا ہوگا؟ کیا واقعی بیگم اس عیاش مرد کی موجودگی کو اور اپنی زناکاری کو قبول کرے گی؟ یہ کبھی نہ ہوگا ——— مگر کیا ہوگا؟ نہیں معلوم!

یہ آخری خیال ـ جو ابتدائی خیال آفرینی کا بانی تھا کمزور ہوتا گیا۔ اپنی چہار دیواری اور اپنی عزت و ناموس کے فقدان کو مستحکم پاکر میں بالآخر نیند کی طرف مائل ہو ہی گئی ـ اور نکلس کو ہاتھ میں اور مظلوم بیگم کی تصویر کو دل میں لیے ہوئے سونے لگی ـ کاش! غریب بیگم کو بھی مجھ بیمیا کی طرح نیند آگئی ہو! مگر اس کے پاس اخفائے جرم کے لیے میری طرح چند در چند ہتھیار کہاں؟ اس کے پاس میری سی فطرت کہاں؟۔ اس کے پاس مجھ سی ہمت کہاں! ——— عورت! شریف عورت کمزور ترین ہستی ہے! اور دنیا کے معیار ہست و بود پر اس کا مقام بے پناہ پستی ہے! عورت مرد کے دوش بدوش کب ہوگی؟ جب عیاشی ختم ہوگی ـ جب مردانہ تفوق مٹ جائیگا جب مردوں کو ٹھوکر پر ٹھوکر لگے گی ـ اور جب عورت اپنا انتقام لیگی ـ خون آشام انتقام! جو رومانی انقلاب ——— عظیم انقلاب ہوگا! اس وقت دنیا مسرت اور خوشی کا گہوارہ ہوگی ـ تب دنیا میں چین ہی چین ہوگا۔ تب دنیا رذیل جرائم سے خالی ہوگی ـ اور ہر طرف جمالیات کی

رقی ضیا بار ہوگی۔ دل منور ہوں گے۔ چہرے درخشاں ہوں گے۔ آنکھیں بینا ہوں گی۔ نظریں ہر طرف ساقیان گلفام کو دیکھکر مسرور ہوں گی۔ مخمور ہونگی۔ اور یہ عالم رنگ و بو انسانی محبت کے نغموں سے معمور ہوگا۔ اور ہر طرف حسن کی ضیاء اور محبت کی لمعات ہونگی! اور دنیا روشن۔ منور۔ اور زریں ہو جائے گی!

مگر دست دراز مرد۔ جابر اور غاصب مرد ناعاقبت اندیش مرد۔ عیاش۔ خود غرض۔ اور ہوس پرست مرد یہ کبھی نہ ہونے دیگا۔ وہ دنیا کو تاریک ہی رکھیگا۔ تاکہ اپنے بھیانک گناہوں کو ضلالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہمیشہ چھپاتا رہے۔

یکم اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

گذشتہ چند ایام اپنی نیرنگیوں کے ساتھ گزر گئے۔ خاموش انسان اپنی خاموش فطرت کی روحانیت سے بلا کا اثر مجھ پر ڈالتا رہا۔ میں نے ہر بار اُس کی دُزدیدہ نگاہی کے برقی تاثرات سے بچنے کی کوشش کی۔ مگر ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ چوٹ کھائی۔ میں نے اس عجیب انسان کو ہمیشہ بھلانے کی کوشش کی۔ مگر کبھی

نہ بھلا سکی! جو چیزیں انسان کی سمجھ میں نہیں آتیں مگر سامنے آتی ہیں وہ دلچسپ بن جاتی ہیں۔ اور جو چیزیں ظاہری آنکھوں کو دکھلائی دیتی ہیں مگر باطنی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ نظر فریب بنجاتی ہیں اور جو ہستیاں دل کو گدگداتی ہیں مگر نہ ہنساتی ہیں۔ نہ ہنستی ہیں۔ اور نہ ہنسنے دیتی ہیں۔ وہ دلفریب بنجاتی ہیں اور گہرے نقوش پیدا کرتی ہیں۔ جو نگاہوں کے نشتر کی برش سے ابھرتے زخم ہو جاتے ہیں۔ اور جب زخم ناسور بنجاتے ہیں تو ان ہستیوں کی بن آتی ہے۔

——— اور جب تک زخم بند رہتے ہیں۔ تو یہ بھی لب بند رہتے ہیں۔ جب زخم کھلتے ہیں تو یہ بھی کھلتے ہیں۔ اور ان کی زبان بھی کھلتی ہے اور تب یہ ایسے ایسے گل کھلاتے ہیں کہ اچھے اچھے بوکھلا جاتے ہیں۔ مجھے کئی بار اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ خاموش انسان انھیں ہستیوں میں سے تو نہیں ہے! اور یہ اندیشہ بڑھ بڑھ کر میرے سامنے آیا کیا لیکن پیر صاحب جیسی چھا جانے والی ہستی نے جذبات کے دریا بہا دئے۔ مسرت کے طوفان اٹھا دیئے فضائے دماغ میں ہوائے دل کی آندھیاں چلا دیں۔ میدان خیال میں سرور و انبساط کی بارشیں برسا دیں۔ اور حضرت خاموش کا اندیشہ خاموش ہواؤں میں اڑا اور بارشوں میں دب دب گیا۔ اگر کبھی ابھرا تو دریاؤں میں بہہ گیا یا طوفان کی نذر ہو گیا۔ مگر اس ہوش ربا ہستی کی اثر انگیزی اور اس کے ہیجان افزا اور جذبہ پرور اندیشہ نے ہمیشہ سکون فضا اور سکوت خیال کا صبر آزما انتظار کیا۔ اور ہواؤں۔ طوفان اور بارشوں کے درمیان؛

ذہنوں میں اپنے تصورات کی تجلیات بجلیاں گراتا رہا میری آوارہ چشمی میں خیرگی پیدا کرتا رہا میں چکا چوند ھ ہو ہو گئی ۔ مگر دائمی چشم بندی سے اِن ولگداز خدشات کی حد بندی ۔ یا نظر بندی نہ کر سکی ۔

کون ہے ؟ کیوں آتا ہے ؟ کیا چاہتا ہے ؟ کب کچھ کہیگا ؟ کیا کہیگا ؟ میں کیا کہونگی ؟ کیا ہو گا ؟ میں کیسے کہوں ؟ کیا کہو ؟ کیسے پوچھوں ؟ کیونکر جانوں ؟ کس طرح پہچانوں ؟ بھولوں تو کیسے بھولوں ؟ کروں تو کیا کروں ؟ کہوں تو کس سے کہوں ؟

یہ تھے اور ہیں وہ سوالات جو دل اپنی تنہائیوں میں مجھ سے اور میں اُس سے کیا کرتی ہوں !

مرد اور عورت دونوں تمام دلفریب اور دلکش مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ۔ قدرت کی بوقلمونی ان کی دیدۂ تشنہ کے لیے تروتازگی بخشتی ہے رنگ برنگ کے پھول ہی نہیں بلکہ سیکڑوں قسم کے رنگوں کی تتلیاں بھی ان کے لیے جاذب نظر ہوتی ہیں ۔ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ ان میں سے ایک کی خاطر دوسرے کو نظر انداز کو دیا گیا ہو ! ۔ کبھی نہیں سنا یا گیا کہ ایک کے واسطے دوسرے کو نظروں سے گرانا واجب قرار دیا گیا ہو ——— لیکن سنا گیا ہے کہ انسانی ۔ الفت ۔ انتخاب اور جذبات نوازی میں اس درجہ تنگی ۔

سہ رنگی یا رنگ برنگی کی اجازت نہیں!

مگر سنتے چلے آئے ہیں کہ مردوں نے اس ہمہ رنگی کو اپنے لیے روا رکھا ہے۔ تو کیا عورت اس فطری حق سے محروم رہ سکتی ہے یا رہ جاتی ہے؟ جواباً یہ بھی سنا گیا ہے کہ۔ ہاں! واقعتاً عورت رہ سکتی ہے۔ اور رہتی ہے! اور شاید یہ (سماج) کا نظریہ ہے جو تمدن کے علمبردار اور صاحب اقتدار مردوں کے یکطرفہ فیصلہ کے تحت پیدا ہوتا ہے بادی النظر میں یہ نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہو لیکن مجھے تو یہ انصاف کی بھی دورنگی معلوم ہوتی ہے۔ مرد اور کوئی شریف عورت اس انصافی دورنگی کو پسند کرے یا نہ کرے مگر میں مشکل ہی سے پسند کر سکتی ہوں ——— مجھے ہمہ رنگی پسند ہونی چاہئیے!——
لیکن مجھے پسند کیا ہے؟ یہ سوال میری نیک ساعتوں اور شب کی تنہائیوں میں یہ جواب پاتا ہے کہ "یک رنگی"۔ "یک رنگی"! اور محض "یک رنگی"! ہی دلی جذبات کا واحد مقصد ہے۔ کیونکہ دل بھی ایک ہے۔ میں بھی ایک ہوں۔ اور یہ تو میں کیسے کہوں کہ "وہ بھی ایک ہے" "اور سب ایک ہے"——— لیکن یہی سوال عشرتکدۂ دل کی بے ہنگامہ و با ہیجان انگیزیوں میں یہ جواب پاتا ہے کہ "تنوع لذت کی جان ہے"۔ "تغیر عین فطرت ہے"۔ بوقلمونی منبع راحت و مسرت ہے"۔

کچھ بھی ہو۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ مرد اس انتخاب کے

جھنجھٹ میں کم پڑتا ہوگا۔ لیکن عورت کے لیے یہ ناگزیر ہے گو میری فطرت نسوانی کا عرصہ ہوا خاتمہ ہو چکا۔ مگر میں اب بھی یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرے لیے میر صاحب اور اس خاموش انسان میں سے کسی ایک کو حقیقی جذبات نوازی کے لیے منتخب کر لینا یا مختص کرنا ضروری ہے مگر سخت مشکل کام ہے میں شاید مجبور ہوں کہ اس انتخاب کے حق کو دانستہ کھو دوں اور اسے بھی ان مردوں ہی کو دیدوں۔ ——— کسقدر مجبوری ——— کتنا جبر ——— کتنا ظلم ———!

مگر یہ سب شاید اس لیے بھی ہے کہ میں طوائف ہوں۔ انتخاب کرنا میرے لیے روا نہیں۔ میں کسی کو مجبور نہیں کر سکتی کہ تم میرے اور محض میرے ہو جاؤ۔ میں اُس سے یہ اقرار کرتے ہوئے یقیناً خجل ہو جاؤنگی کہ میں اُس کی اور محض اس کی ہوں۔ لیکن کیا مجھ سے یہی جملے کہنے والا کوئی مرد خجل نہ ہو گا! ——— کہہ سکیگا؟ کہ میں تیرا ہوں! ——— مگر اس بازار حسن میں گندوں کا سودا گندا اور گندوں سے ہی ہوتا ہے اندھوں کا سودا اندھے ہی خریدتے ہیں گندے گندوں سے کہتے رہتے ہیں "ہم پاک صاف ہیں"۔ اور اندھے اندھوں سے کہدیتے ہیں "کچھ دیکھکر ہی تو سودا کر رہے ہیں۔" دوسرا فریق یقین کرنے پر مجبور ہے۔ ورنہ کرے بھی تو کیا کرے۔ سودا کیسے ہو۔ بازار کیسے قائم رہے۔ اندھوں کی دنیا! گندوں کے

متعفن گرم گرم سانس! گرمی قلب سے نکلی ہوئی دھواں دھار آہیں! یہ گرم ہوس اور آتش عشق اور نفس کی بھٹی! زمانے کی ہوا چلتی ہے آگ سلگتی ہے۔ دھواں نکلتا ہے پھر ہوا و ہوس کی آندھیاں چلتی ہیں۔ آگ جل اٹھی ہے شعلے نکلنے لگتے ہیں بھٹی بھڑکتی ہے اور سیکڑوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے میں بھی ڈرتی رہتی ہوں کہ کہیں میں جل نہ جاؤں!۔

میرا وجدان کہتا ہے کہ میں جلوں گی ضرور۔ مگر یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ کس کو اس آگ میں اپنے ساتھ جلاؤں گی میرا پیشہ ہی جلانا ہے۔ عشاق! پاگل عشاق تقریباً سب شاعرانہ خیال کے حامل ہوتے ہیں۔ کہتے رہتے ہیں۔ لیلیٰ! تم ہمیں جلاتی ہو مگر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی محض شاعری ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ یہ حقیقت ہے لیکن جب اس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں اور تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ تو جلانے والے کو کوستے ہیں۔ اور اور یہ کبھی تسلیم نہیں کرتے کہ آگ میں جلانے والی کے یہاں خوشی خوشی جاتے تھے اور اس کو شاعری سمجھتے تھے

اور ان کو یہ تو کبھی کبھی سلیم نہ ہو گا کہ وہ جلانے والی بھی آخرش جل مرتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس نے کئی کو جلایا۔ لیکن کئی نے مل کر اس کو جلا دیا۔ ان کی شاعری کا اشہب فکر بس سے آگے کبھی نہیں پہنچتا کہ ایک شمع کئی پروانوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ لیکن یہ کبھی ان کے خیال میں نہیں آتا کہ شمع خود جلتی رہتی ہے اور آخر کار جل جل کر بجھ جاتی ہے۔ تم ظریفی تو

یہ ہے کہ شمع فروزاں کہا۔ شعلہ افروز کہا۔ شمع روشن کہا۔ آگ کو جلنے کو۔ اور دھوئیں کو تسلیم کیا۔ لیکن نہ آگ کا تجزیہ کیا۔ نہ غریب شمع کا! اور نہ تخلیق وترکیب پر غور کیا اور نہ ہی اُس کے آغاز پر نظر ڈالی اور نہ ہی جلتے ہوئے کلیجہ والی شمع کا کبھی انجام سوچا! کم بختو کبھی نہ جان سکے کہ تم ہی شمع بناتے ہو۔ تم ہی اس کو آگ لگاتے ہو تم ہی میں سے چند اس کو بازار میں لاتے ہیں۔ دکانوں میں سجاتے ہیں تم ہی اس کو خریدتے ہو۔ تم ہی اس کی لو لگاتے ہو اور شمع کی لو کمی یا بیشی پر قیمتی لگاتے ہو غضب تو یہ ہے کہ اس کو معرض وجود میں لانے کے لیے سب سے پہلے تم ہی اس میں آگ لگاتے ہو۔ تم ہی اس کو روشن کرتے ہو اور تم اس کو "شمع محفل" اور "دود ول" بناتے ہو۔ موم اور تیل ڈال کر جلاتے ہو۔ جب وہ جلتی ہے تو تم اُس کو چمکتی اور بھڑکتی ہوئی دیکھ کر خوش ہوتے ہو جلاتے رہتے ہو۔ جب وہ تمہاری لگائی ہوئی آگ سے فروغ پاتی ہے۔ جب وہ بقول تمہارے "شعلہ افروز" ہوتی ہے۔ تم اظہار مسرت کرتے ہو۔ لیکن عقل اسقدر رسا رکھتے ہو کہ غور ہی چکا چوندھ ہو کر آنکھ بند کر کے اپنی ہی جلائی ہوئی شمع سے جلنا چاہتے ہو ذرا سے جرکہ پر دھواں دھار شاعری کرتے ہو۔ لیکن اس جلتی ہوئی شمع کے متعلق کبھی بھولے سے بھی ایک شعر نہیں کہتے۔ جلتی ہوئی پر رحم تو کیسا اس کو ظالم۔ قاتل اور جلانے والی کہتے پھرتے ہو۔ لیکن کبھی یہ غور نہیں کرتے کہ شمع کی ابتدا تمہارے

پا نھوں" جلنا" ہے اور انتہا تمھاری زہریلی پھونک سے بجھتا" ہے۔ اور اگر کسر باقی چھوڑ بھی دیتی ہو تو وہ تمھاری لگائی ہوئی آگ میں جل جل کر خود بھی فنا ہو جاتی ہے۔ کہ کیا کبھی تم کو کسی شمع کے دم توڑتے وقت رحم آیا ہے؟ کیا کبھی کسی شمع کو تم نے حقیقت کی آنکھ سے بھڑکتے ہوئے دیکھا ہے اور کچھ سوچا ہے؟ نہیں جانتے ہو گے کہ وہ زمانہ کی ہوا کے خفیف جھونکے میں لرز جاتی ہے! کیسا اٹھتی ہے! نہیں جانتے کہ اس کو کسی ایک پروانہ کا ہمیشہ کے لیے گل کر دینا ہے۔ تمھارا بے ہنگام قہقہہ۔ تمھار ی کی معمولی گردش اس کے مقابل ہوتے ہی اس کو لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ کیا کبھی تم نے اس کے کلیجہ کو جل کر پگھل کر بہتے ہوئے دیکھا ہے؟ کیا کبھی اس کے کلیجہ سے غم کے دھوئیں کو نکلتے ہوئے دیکھا ہے؟ کیا کبھی شمع کی جانکنی اور نزع کے دھوئیں سے اور ہر بہ شمع کے زخم کی ناخوشگوار بو سے آشنا ہوئے ہو؟ کیا کبھی شمع کے فنا ہو جانے پر اس نشتر لگے ہوئے نمایاں ناسور کو چشم عبرت سے دیکھا ہے جو یقیناً اس کا دل سوختہ ہوتا ہے! یا لوح مزار ہوتی ہے لیکن تم اس کو "گل" کے نام سے پکارتے ہو۔ نہیں جانتے یہ اس کا جلا ہوا دل ہے! اطلبوا! کبھی کبھی تم اسی پر قینچیاں چلاتے ہو۔ کاٹ کر پھینک دیتے ہو۔ اور شمع کے دل کی آگ کو اور بڑھا دیتے ہو۔ اس کے جلانے میں تمھیں مسرت ہوتی ہے۔ اور ہر جب تم اپنے تاریک خانۂ ہوس میں روشنی پیدا کرنے کیلئے

کرتے ہو - اور جلتی ہوئی آگ میں عود و عنبر ڈالکر - دھوئیں اُڑاکر - خوشبوؤں سے مست ہوکر نفس کے دیوتا کی پوجا کرتے ہو -

لیکن شجر شمع کے آخری - گل - پر تمھارا اس لیے بس نہیں چلتا کہ اب چراغ جلنے کا اندھیرا سب طرف چھا جاتا ہے اور تمھاری ہوس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور تمھاری خود غرضی کی یہ انتہا ہوتی ہے کہ تم دن کی روشنی میں شمع کے اس آخری گل کو بھی خاک بناکر شمع خانہ سے باہر پھینکدیتے ہو اور مٹی میں ملا دیتے ہو -

---

جو چاہے کرو - جو چاہے کہو - تم شاعر ہو مرد ہو - اپنے دماغ پر اپنی طاقت پر اپنے قابو اور اختیارات پر تمھیں ناز ہے لیکن اگر میں شاعر ہوتی - تو ان پروانوں کو بدتمیز ظالم - اندھے اور بے وقوف کہتی اور شمع کو دل جلی - زخمی - مظلوم اور بیکس کہتی - اور یہی سچ بھی ہوتا ! - لیکن دنیا میں تمھارا راج ہے الفاظ اور اور تحریر اور زبان کے بادشاہ ہو - جو چاہے کہو جو چاہے لکھو اور اپنی دنیا سے آنکھ بند کر کے تسلیم کراؤ - کاش ! میں شاعر دل سے کچھ انتقام لے سکتی ! یا شمع محفل مرد ہوتے ! یا مرد طوائف بنکر بالاخانے پر بیٹھتے اور عورتیں پروانہ بنکر ان بالاخانوں کی شمعوں کے پاس جاکر عیاشی اور شاعری فرمایا کرتیں ! تب مرد کو حقیقت معلوم ہوتی ! اس کی سٹی گم ہو جاتی - چھٹی کا دودھ یاد آجاتا اور بھولا ہوا سبق یاد آجاتا جس کو ہمیشہ یاد رکھتا ! -!

خیر گانا ہوا۔ میر صاحب آئے اور وہ خاموش ہستی بھی آئی۔ لیکن گانا ختم ہونے سے پہلے ہی یہ لوگ چلے گئے اور میرا شریکِ بستر ایک ایسا شخص ہوا جو قدرے شاعر تھا اور میں نے اس کی تمام شب ایسی خبر لی۔ کہ اس نے گھبرا کر آیندہ نہ آنے کا عہد کر لیا۔ کاش یہ اس کا عہد مستحکم ثابت ہو —— شاعر! شاعر! شاعر! خدا مجھ کو ان شاعروں سے بچائے! اور ہمیشہ بچائے رکھے ——————

دیکھئے بچتی ہوں یا خود شاعر بننے میں کامیاب ہوتی ہوں ——!

۱۷/ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

دو ہفتے توازن دماغی کے گرنے اور سنبھالنے میں صرف ہو گئے۔ چند واقعات ایسے پیش آئے جن سے خلفشار پیدا ہوا اور چند ایسے خوشگوار واقعات اور اتفاقات پیش آئے کہ جن سے حیات کی بیچینوں کا روح افزا تبادلہ ہوا اور شاید کچھ تلافی مکافات بھی ہوئی! بہر نوع حیات کی بساط کے دو چھوٹے ٹکڑے نفس اور ضمیر قینچیوں کی قطع و برید سے کٹ گئے۔ کٹتے ہی رہتے ہیں یہ ٹکڑے! اور چلتی ہی رہتی ہے یہ قینچی! کہتے ہیں کہ کٹے ہوئے ٹکڑے پھر جڑیں گے اور بساطِ حیات اپنی تمام

پہنائی کے ساتھ ان کو پھر میسر ہو گی ۔ اور ٹکڑوں کی قطع و برید کی اچھائی اور برائی داغ دھبوں اور صفائی کے مطابق اس بساطِ حیات کو سطحِ بہشت یا آتشِ جہنم پر بچھا یا جائے گا ۔

اول تو میری بساط ہی کیا ہے ! لیکن جو کچھ بھی ہے وہ یقیناً آتشی ہے ناری ہے اس کو نار سے ہی واسطہ ہو گا ! مگر میں سوچا کرتی ہوں کہ ابھی میری بساط زندگی کے حصے کون سے عیش بیجا میں گزر رہے ہیں جن کی پاداش میں مجھے نارِ جہنم میں جلنا ہو گا ۔ جو کچھ ہو رہا ہے میری مرضی کے خلاف ہو رہا ہے ۔ میں شاذ و نادر ہی اپنی خوشی سے گاتی بجاتی ہوں ہمیشہ میری منشا و رغبت کے خلاف میرا بستر آراستہ ہوتا ہے اور ہمیشہ میرے دل و دماغ کے جذبات کے خلاف کوئی گرم یا ٹھنڈی آغوش ہوتی ہے جس میں میں خود کو سونپنے کے لیے مجبور ہوں ۔

اتصالِ جنسی صحبت غیر محرم ۔ گناہ ہیں ۔ وہ بھی کبیرہ ۔ شراب پینا عیاشی کرنا ۔ یہ بھی گناہ کبیرہ ہیں ۔ لیکن ان سب گناہوں کا فاعل اور مرتکب کسی نہ کسی عیش بیجا سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔ اس کے دماغ میں ارادہ اور اس کے پاس قوتِ عمل ہوتی ہے ۔ لیکن میرے یہاں تینوں حالتوں کا فقدان ہے نہ میں ارادہ کرتی ہوں نہ قوتِ عمل رکھتی ہوں اور نہ ہی محظوظ ہوتی ہوں ۔ بلکہ دلِ مجبور کی طرح گلِ مجبور ہوں ۔ جو چاہتا ہے مسل ڈالتا ہے ۔ دستِ تظلم کی چھریاں چلاتا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ زندگی کے پودے میں وہ آبیاری کرتا ہے ۔ اتنی کہ پودا سرسبز و شاداب رہے ۔ اور گلہائے رنگ و بو پیدا ہو کر

اُن کی چشم نفس کے لیے تر و تازہ رہیں اور بس !۔

باالفاظ دیگر یوں کہونگی کہ میں گربہ مسکیں ہوں دودھ اور گوشت میری خوراک ہے۔ جس کو حاصل کرنے کے مجھ کو غُرغُر کرنا پڑتا ہے جو چاہتا ہے مجھ کو گود میں اُٹھا لیتا ہے۔ جب جی بھر جاتا ہے زمین پر پٹک دیتا ہے۔ اکثر ایسے لوگ۔ مجھے گود میں لیتے ہیں جن کو بلّی کے ملائم روئیں۔ نازک جسم اور غرغر کرنے کے فطری جذبات کی نہ تو قدر ہوتی ہے اور نہ پروا ۔ جب تک چاہا گود میں رکھا۔ چمکارا۔ پیار کیا۔ ہاتھ پھیرا۔ اور جب طبیعت بھر گئی۔ تو گردن یا ٹانگ پکڑ کر لٹکا دیا اور چھوڑ دیا۔ محبت بھی ختم شاعری بھی ختم۔ اور دوستی بھی ختم! اب بلّی چاہے بھی تو گود میں سوار نہیں ہو سکتی۔ غذا تک کے لیے سر پٹکے تو نہیں مل سکتی۔ بلکہ دسترخوان کے پاس پھٹکے بھی تو ڈانٹ ہی نہیں بلکہ ڈنڈا کھاتی ہے

جی چاہتا ہے کہ اپنا یا اُن کا منہ نوچ لوں۔ مگر یہ بھی نہیں کر سکتی۔ مجبور ہوں۔۔ بیحد مجبور!۔ میں ہر جگہ اپنے آپ کو مجبور۔ سراپا بیدست و پا پاتی ہوں مجبوریوں کو سوچتے سوچتے اور بھی مجبور ہو گئی ہوں۔ استدلال کی نظر میں مجبور معلوم بھی ہوتی ہوں۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں۔ بلکہ ہوں خود مختار ہوں۔ گھر کی مالک ہوں۔ حکومت کرتی ہوں مردوں کے دل پر بھی حکومت کرتی ہوں بلکہ ظلم رانی کرتی ہوں۔ جو چاہتی ہوں سو کرتی ہوں۔ سبحان اللہ میں کتنی ہوں مظلوم ہوں۔ مجبور ہوں!۔ دنیا کہتی ہے کہ ظالم ہوں۔ آزاد ہوں بااختیار ہوں! عجیب ہوں میں

اور میری زندگی! اور عجیب ہے دنیا اور دنیا کی رات۔ ٹھنڈے دل سے پیچھے دل سے ضمیر خفتہ کی بیداری کے وقت اگر سوچتی ہوں تو ایک تخئیل کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ اور بتلاتی ہے کہ میں مجبور نہیں ہوں۔ بلکہ خود کو مجبور محض بنائے ہوں۔ جو خود کو مجبور بنانے پر قدرت رکھتا ہے وہ خود کو آزاد بنانے پر بھی قادر ہے۔ میں چاہوں تو گناہ کی چار دیواری سے باہر بھی جا سکتی ہوں۔ میرا مادی دل کہتا ہے کہ میں باہر جانا چاہتی ہوں۔ مگر نہیں جا سکتی لیکن میرا معنوی دل کہتا ہے "یہ سراپا غلط ہے تو نے جانا چاہا ہی نہیں۔ اگرچہ چاہتی تو باہر جاتا کیا معنی یہاں آ ہی نہیں سکتی تھی لائی بھی جاتی۔ آ بھی جاتی تو ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی اب بھی اگر چاہے تو باہر جا سکتی ہے"۔ یہ میرے دل کی معنوی صدا ہے۔ جس سے میں غافل ہو کر ہمیشہ سکوت اختیار کرتی ہوں اور یہیں [illegible] جمود میں جم کر ٹھٹھر کر رہ جاتی ہوں۔ یہی صدا ہے جس سے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو کبھی کبھی ٹال لیتی ہوں اور کانپ اٹھتی ہوں۔ ______

لیکن میں اپنے ہر فعل پر قادر ہوں۔ میں باز رہ سکتی ہوں نہیں رہتی! ______ نہیں چاہتی! جو چاہتی ہوں وہ عیش گزاری اور عیش پسندی ہے۔ عیش کی طالب ہوں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ میں جائز عیش کی طالب تھی مگر وہ نہ حاصل ہو سکا۔ اور ناجائز عیش بجبر و اکراہ حاصل ہو گیا۔ اور میں سیر ہونے لگی۔ ہو گئی سوئی ہوتی! کبھی اگر جاگتی ہوں تو ملال آتے اور فلک کی دلجوئیاں مجھے

اشاروں سے بلاتی ہیں ۔ اپنی مسکراہٹ سے میرا استقبال کرتی رہتی وہ روحانی مسرت کے ترانے گاتی ہیں نغموں کی باطنی دلکشی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے ۔ لیکن جیسے قدم بڑھاتی ہوں ڈر جاتی ہوں سہم جاتی ہوں ۔ اور ٹھٹھک کر رہ جاتی ہوں خدا جانے کب تک قعر ذلت میں پڑی رہوں گی

میں سمجھتی بھی ہوں اور نہیں بھی سمجھتی ۔ کر سکتی ہوں ۔ کرنا چاہتی ہوں نہیں کرتی ! ۔ خدا جانے کب کروں گی ! اور کیا کرونگی ؟ کئی دفعہ خیال آیا کہ منگیتر کو خط لکھوں ۔ بلاؤں ۔ اور دکھڑا روؤں ممکن ہے ان کو رحم آجائے ۔ اور مجھے وہ قعر ضلالت سے نکال لیں ۔ اور یہ خیال آتا ہے کہ کاش میر صاحب جلد شادی کر لیں اور مجھ کو اس گڑھے سے نکال لیں ۔ لیکن چاہتی یہی ہوں کہ کوئی نکال لے ! خود نہیں نکلتی " گر نکلنا چاہتی ہوں ۔ دیکھئے کب کوئی نکالتا ہے ؟ ۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھتی کہ گناہ کے سمندر میں کودنے والے خشکی سے بیزار ہوتے ہیں اور وہ سمندر میں تیرنا ہی اپنی فطرت کا اقتضا اور فشا سمجھتے ہیں

میری عقل ! میری دانش ! کیا کہوں اس کو ! خیال کئے بیٹھی ہوں کہ کپڑے کا شائق میلا کچیلا تھان خریدے گا ۔ اور گھر لیجا کر غلاظت اور دھبوں کو دھو کر سکھائیگا ۔ یہ نہیں سمجھتی کہ خود کیوں نہ دھل جاؤں خود کیوں نہ سوکھ جاؤں ۔ خود کیوں نہ پاک صاف ہو کر اجلی ہو جاؤں اور پھر توقع رکھوں کہ کوئی نہ کوئی ذرا کانٹ چھانٹ کر سی سلا کر

عمدہ لباس بناکر زیب جسم کرے گا۔ کتنی اُلٹی ہوں میں! اور کتنی اُلٹی میری عقل! جانتی بوجھتی ہوں لیکن کرتی دھرتی کچھ نہیں! اور۔ ہاں! کروں بھی کیسے جبکہ شب کی ہنگامہ آرائیاں عشاق کی دست درازیاں۔ رندان پارسا کی شب بیداریاں اور میری تھکی ہوئی جماہیاں فرصت نہیں لینے دیتیں۔ ۱۷/ اپریل کی شب۔ بلا خیز شب تھی ایک بوڑھے ڈاڑھی والے سے سابقہ تھا اس کی تھکی ہوئی آغوش بوڑھا جوش و خروش ہوس پرستی کی انتہا لیے ہوئے تھا۔ کمبخت شراب پیتا جاتا تھا اور اناپ شناپ بکتا جاتا تھا۔ شراب میں بھری ہوئی ڈاڑھی۔ اور متعفن سانس سے میرا ناک میں دم تھا۔ مگر ہر صدا پر لبیک اور ہر حرکت ناروا پر خیر مقدم میرے پیشہ کا فریضہ تھا جس میں خون کے آنسو پی کر ادا کر رہی تھی

تنگ آکر میں نے اُس کام کو شروع کر دیا جس سے پہلے انکار کر چکی تھی۔ ساقی گری شروع کر دی اور کمبخت بڈھے کھوسٹ کو اتنی پلا دی کہ وہ آخر کار بیہوش ہو گیا۔ اور کمرے کے کونے میں سو گیا۔ اُس کو ٹھکانے لگا کر اب میں بستر پر آئی اور چت لیٹ گئی لیکن جذبات نے کروٹ لی اور میں نے بھی اس بوڑھے عیاش کی طرف کروٹ بدلی ——— تمسخر انگیز صورت دیکھتی رہی اور کچھ ایسی سوجھی جو اس سے پہلے کبھی نہ سوجھی تھی۔ قینچی اٹھائی اور اس منحوس کی ڈاڑھی صاف کر ڈالی اور اتنا ہنسی کہ لوٹ لوٹ گئی۔ آخر کار اس ہولناک شب کو بھی میں نے حتی الوسع خوشگوار بنانے کی کوشش تمسخر کے

رنگ میں کی۔ اور کامیاب اور مطمئن ہوکر سوگئی۔ مگر نیند میں ور ڈر گئی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسے ریاکاروں کو اپنی ڈارھی بہت عزیز ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اسی کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں۔ خوف تھا کہ غضب کا رنگ لائیں گے اور بلا کا پیچ و تاب کھائیں گے۔ مگر میرے پیشہ کے ہتھیار "لگاوٹ" اور نشتر غمزہ" دونوں ہمت افزا اور سکون بخش تھے میں نے گھبرا کر ان کو ساڑھے چار بجے اٹھا دیا اور خوب سا بناوٹی اعتنا اور تعریف و توصیف کر کے ان کو اندھیرے میں رخصت کر دیا۔ تاکہ ریش مبارک کی حجامت کا راز ابھی سے افشا نہ ہو جائے! اور بیوی کے سامنے یا احبا کے روبرو۔ میرا ستم انگیز مذاق خوب گل کھلائے اور ان کو غرق ندامت میں ڈبائے

۲۹/اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

قلبی کیفیات کے مدوجزر۔ عیش و تنعم کی رنگ رلیوں اور شب باشی کی دلکشیوں اور تلخیوں کے ساتھ گزشتہ دو ہفتے گذر گئے۔ ۲۹/اپریل کی شب بھونچال کی طرح آئی اور سرشام تھما

مجھے بتلا دیا گیا کہ میں کسی رئیس کے یہاں جانے والی ہوں۔ میری رضامندی کسی نہ کسی طرح حاصل کرلی گئی تھی۔ چنانچہ شب کے دس بجے موٹر آئی مجھ کو سوار کرایا گیا اور نعیم صاحب کے مکان پر پہنچا دیا گیا۔ رنگ روپ کے اچھے تھے عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ البتہ چیچک کے داغ چہرے کو بدرونق بنائے ہوئے تھے۔ میرا استقبال گرمجوشی سے ضرور ہوا مگر رئیس صاحب اپنے جسم کے لرزہ کو نہ چھپا سکے۔ چہرے پر بھی رنگ آیا۔ اور آنکھیں بھی دو چار بار جھپکیں۔ اور مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ میں نے حریف کو مغلوب کرلیا ہے۔ مرد اپنی اس لرزہ براندامی کو "رعب حسن" اور "ابتدائے عشق" سے تعبیر کیا کرتے ہیں لیکن عورت کے نزدیک مرد کی یہ علامت شکست ہے جس کا اعتراف وہ آنکھوں سے فوراً کردیتا ہے۔ بہرکیف میرا سینہ تن گیا۔ گردن اونچی ہو گئی اور اپنا قد کچھ اونچا معلوم ہونے لگا۔ میں نے "تشریف رکھئے" کے جملہ کو اس وقت سنا جبکہ میں ایک صوفہ پر متمکن ہو چکی تھی نعیم صاحب نے چوری کی نظر سے مجھے دیکھا اور گھبراہٹ کو ہٹانے کے لیے نوکروں کو دو چار الٹے سیدھے حکم دے ڈالے۔ اور پھر خود بھی بیٹھ گئے۔ مگر ایک کوچ پر اور مجھ سے کافی دور! ـ

یہ دوری بلا کی دوری تھی۔ بلا مبالغہ ایک بجے تک قائم رہی۔ اب اُن کی نظریں بجائے جھپکنے کے شاید تاب نہ لاکر نیچے رہنے لگیں اور وہ نیچا دیکھنے لگے۔ باتیں بھی اسقدر الٹ پلٹ کرتے ہے

کہ جن کا کوئی تک تھا نہ سر تھا نہ پیر! دلچسپی کے عنصر سے قطعاً خالی نہیں۔ اب وہ کچھ دل میں ٹھان کر اُٹھے اور الماری کی دراز سے بوتل نکالی اور قریب کی چھوٹی میز پر رکھی۔ اور "معاف کیجئے گا میں کبھی کبھی........." کہکر پینے لگے۔ میں نے کہا۔ "شاید آپ ضرورتاً پیتے ہیں"؟ بولے "نہیں بلکہ دوا"۔ میں نے دھرایا۔ "دوا کے طور پر" انھوں نے۔ "جی ہاں" کہا اور بہت سی چڑھا گئے۔ میں نے پوچھا "کیا مرض ہے جناب کو"؟ فرمایا۔ "کبھی کبھی اختلاج ہوتا ہے"۔ میں نے ایک قہقہہ لگایا جس پر ان کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا اور شراب فرش کی نذر ہوگئی۔ خجل ہوکر اٹھے اور میری طرف بڑھے۔ اتفاقاً میں بھی کھڑی ہوگئی میرے انداز میں توانائی کا اظہار بے ارادہ تھا۔ لیکن وہ کچھ ٹھکر رُکے اور کھڑے ہوگئے۔ "لیلیٰ! تم بڑی حسین ہو"۔ کہکر برابر کی کرسی پر گر پڑے۔ اور پھر فرمایا۔ "میں تم پر سچے دل سے عاشق ہوں"۔ میں نے پھر ایک بنانے والا قہقہہ لگایا اور کہا۔ "کیا آپ کبھی کسی پر جھوٹے دل سے بھی عاشق ہوئے ہیں"۔ انھوں نے اینٹھتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں" میں نے ذرا سے وقفہ کے بعد پوچھا "کیا آپ کبھی پہلے بھی کسی پر عاشق ہوئے ہیں؟ وہ ذرا سوچنے لگے اور کچھ رُکتے ہوئے بولے "شاید۔ ہاں........." میں پھر اپنے قہقہہ کو نہ روک سکی۔ رئیس صاحب نے خدا جانے کیا سمجھا اور کہا۔ لیلیٰ! تم بڑی شوخ ہو! میں نے جواب دیا۔ "معاف کیجئے گا

ہر طوائف شوخ ہوتی ہے۔ اور ہر شخص کو آپ کی طرح اس سے عشق ہوتا ہے"۔ فوراً فرمایا۔ "کیا سچے دل سے"؟ میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ "سچے اور بالکل سچے دل سے"! انھوں نے ذرا ناک چڑھا کر کہا۔ "ناممکن ہے"۔ میں مرد کی فطرت کا کافی مطالعہ اور مشاہدہ کر چکی ہوں فوراً سمجھ گئی کہ اب انکی کمزوری کی رگ بھڑک رہی ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ میں نے کہا۔ "ممکن ہے آپ بیحد شریف طبیعت کے انسان ہوں اور واقعی مجھے سچے دل سے چاہتے ہوں"۔ انھوں نے اکڑ کر کہا۔ "یہ ایک حقیقت ہے جس کا ثبوت تم کو خود ہی ملجائیگا"۔ میں نے ان کے "اکڑ" کے جذبہ کو زوردار بنانے کے لیے کہا۔ "ہاں! ثبوت البتہ ایک چیز ہے جس کی میں کیا! دنیا قائل ہے"! زوردار لہجے میں فوراً بول اُٹھے "ہاں! میں آپ کا سچا عاشق ہوں اور سب کچھ آپ پر قربان کر سکتا ہوں"۔ میں نے طنزاً اور ذرا کھینچکر۔ "ہاں آ"۔ کہا انھوں نے اکڑ کر اور سنبھلکر کہا۔ "جی ہاں"۔ میں نے اب ایک دوسرا ہتھیار استعمال کیا اور اپنی جگہ سے اُٹھکر ان کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی اور بائیں ہاتھ کو اُن کی گردن میں حمائل کر دیا۔ سنسنی پیدا ہوئی اور انکی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں نے دو چار اسی قسم کی حرکتوں کے بعد التجا آمیز عشوہ کے ساتھ کہا۔ "میں اس وقت صرف پانچسو روپیہ کی مقروض ہوں اور میرے پاس کوئی ذاتی مکان بھی نہیں ہے"۔ کرسی سے اٹھ کر بلکہ اچک کر اور میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

"بس اتنی سی بات" ! اب ادھر ادھر دیکھ کر دوسرے کمرے میں آہستہ سے گئے اور پانچسو کے نوٹ لائے اور میرے سامنے کرسی پر پھینکدیے اور فرمایا — "مکان جس جگہ اور جس قسم کا آپ چاہیں گی خرید دیا جائیگا" میں نے نوٹوں کو سنبھالا اور ———— یہاں کیسے لکھوں کہ طوائف کبھی کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتی جلب منفعت کے ایسے نازک موقعوں پر وہ جھکتی ضرور ہے اور زبان سے تشکر آمیز کلمات بھی نکالتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر محض اپنی عیاری کی داد اپنے نفس کو دیا کرتی ہے اور خوش ہوا کرتی ہے ——— چنانچہ میں نے شکریہ ضرور ادا کیا اور الفاظ بھی چکنے چپڑے استعمال کیے لیکن دل میں میں یہ ہی کہہ رہی تھی کہ — "خوب الو بنایا ہے گدھے کو" ! ——— الغرض مکان کے خواب اور پانچسو کی گرمی نے قلب کو گرما دیا اور یہ سونی محفل گرم ہو گئی ————————

چلتے وقت ایسی گفتگو اور معاہدے شروع ہو گئے کہ قسما قسمی پر آ گئے - مجھ کو قسمیں زیادہ یاد تھیں اور ان کو کم ! میں عشق لڑانا زیادہ جانتی تھی اور وہ کم ! از ابتدا تا انتہا ان کو ہار ہی ہار ہو رہی تھی .. اور وہ اس فکر میں تھے کہ آخری وقت میں ہی کوئی مردانہ جوہر دکھلائیں !

اسی لگا وٹ اور بیجا اشتیاق میں دن نکل آیا - میں نے کئی بار جانا چاہا لیکن انھوں نے سچے دل سے چاہنے کی پیچ میں مجھے بار بار اصرار

کے ساتھ روکا۔ میں چلتے وقت اُن کو۔'' مکان کے خواب'' کی خاطر ناراض نہ کرنا چاہتی تھی اور وہ آسانی سے اجازت دیدینے سے دل کی چاہت کی توہین سمجھتے تھے۔ حالانکہ تکدُّر اور انقباض دونوں طرف موجود تھا اور بڑھتا جارہا تھا ——————

چائے آئی اور پینے کا اصرار ہوا۔ اب کیا کہئے۔ زہر مار کرنی پڑی۔ سوچ ہی رہی تھی کہ اب ضرور چھٹکارا ملجائیگا۔ کہ اتنے میں

—————— عمر بھر نہ بھولوں گی جو پیش آیا ——————

اُن کی بیگم صاحبہ بیحد برافروختہ اور درّانہ کمرے میں داخل ہوئیں اُن کی نگاہوں میں غیظ و غضب تھا۔ شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھیں۔ نسوانی آواز کی انتہائی کرختگی میں انھوں نے پے بہ پے اور متعدد سوالات اپنے شوہر سے کیے۔ مگر ان کو سانپ سونگھ گیا تھا! بیدم تھے! اور بید لرزاں کی طرح کانپ رہے تھے گومگو اور کشمکش میں مبتلا تھے۔ میں نے ہمت سے کام لیا اور اٹھ گئی۔ موقعہ کو غنیمت جان کر دروازہ کا رخ کیا۔ جیسے ہی پلٹی ——————

کیسے لکھوں! مگر چھپاؤں بھی کیسے! ——— جیسے ہی مڑی سر پر جوتے کی وہ ضرب پڑی مزاج بجال ہوگیا۔ میں اپنے کو سنبھال ہی رہی تھی کہ تڑاتڑ کہ دو چار جوتیاں اور پڑ گئیں اور میں اپنے حواس کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ اور پلٹ کر بیگم صاحبہ کو لپٹ گئی اور بغیر کچھ بولے ہوئے میں نے اپنی بازاری جرات سے اُن کو زمین پر گرادیا۔ چاہتی تھی کہ میں بھی ان کو جوتی سے ماروں۔ مگر ہاتھ نہ اُٹھاسکی۔ لیکن ان پر

سوار ضرور رہی ۔ جس کی وجہ شائد یہ تھی کہ خوف تھا کہ وہ اُٹھتے ہی پھر جوتیاں برسائیں گی ۔ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کروں ۔ کہ بیگم صاحب کی چیخ و پکار نے تمام مکان کو سر پر اٹھا لیا اور سب ملازمین اور متعلقین کمرے میں جمع ہو گئے ۔ مگر ایک دو منٹ کے لیے ہر شخص پس و پیش کرتا رہا ۔ میں نے اب موقعہ کی نزاکت کا احساس کیا اور بیگم صاحبہ کے سینہ سے اُتر کر جلدی سے کھڑی ہو گئی ۔ اور میں نے کہا ۔ " میری کیا خطا ہے ؟ ۔ کہو سنو اپنے شوہر سے جنھوں نے مجھے بلایا ہے ! ۔ اب بیگم صاحبہ اپنے شوہر پر برس پڑیں اور سوائے جوتہ مارنے کے اور سب کچھ کر گزریں جس میں دو ہتھڑ کوسنا اور لعن طعن سب شامل تھا ۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط نوکرانی نے بیگم صاحبہ کو شادی اور اب یہ دونوں ملکر مجھ پر ٹوٹ پڑیں ۔ نوکرانی کی اس حرکت سے میں سخت بدحواس ہو گئی ۔ اس نے مجھے مضبوط پکڑ لیا اور بیگم صاحبہ نے مجھ پر جوتے برسانے شروع کر دئے ۔ جوتی پیزار اور گھونسہ جب سب ختم ہو گیا تو ان کو لکڑی یاد آئی ۔ چیخ کر کہا ۔ کمبختو کھڑے دیکھتے ہو لاؤ لاٹھی لاؤ جلدی ! میں اس بیسوا کو جان سے مار ڈالوں گی " ۔ شوہر صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے اور میرے دسول کو بن گئی ۔ میں کافی مار کھا چکی تھی ۔ لکڑی سے پٹنا میرے بس کا نہ تھا ۔ میں تڑپی اور اپنی پوری قوت سے نوکرانی کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی اب رئیس صاحب نے نوکرانی کو مارنا شروع کیا ۔ جس سے مجھے فرار ہونے کا موقعہ مل گیا ۔ اور میں باہر نکل آئی ۔ میرے نوکر سراسیمہ

کھڑے تھے۔ مجھے اُن پر قطعاً غصہ نہ آیا کہ وہ کیوں اندر نہ آئے
میں جانتی تھی کہ بیگم صاحبہ کے موجود ہونے نے ان کو کافی سے
زیادہ بے بس کر دیا ہوگا۔ الغرض احاطہ سے باہر نکلے اور ہم تینوں
تیزی سے بھاگے۔ خدا خدا کر کے تانگہ ہاتھ آیا جس میں بغیر کرایہ
طے کئے ہوئے ہم سوار ہو گئے۔ دم پھولا ہوا تھا۔ تانگہ والے کو
تنا کہہ سکے کہ خواب تیز چلاؤ۔ اور سیدھا لے چلو۔

تانگہ تیزی سے بھاگ رہا تھا اور خوف مجھ کو بھاگ رہا تھا۔
سانس اب تیزی سے کم آرہا تھا اور مجھے ہوش زیادہ آرہا تھا۔ لیکن
جوں جوں ہوش آرہا تھا۔ چوٹ اور درد کا زیادہ احساس ہورہا تھا۔
ہوش اور درد دونوں بڑھتے رہے۔ دل بیٹھتا رہا۔ کلیجہ اچھلتا رہا۔
چوٹوں کی تکلیف اسقدر زیادہ بڑھ گئی کہ میں غشی محسوس کرنے لگی۔
اور اپنے جسم کو نوکروں کے سپرد کرنے پر مجبور ہو گئی ——————
دو مردوں کی گود کی گرمی اور پانچسو نقد کی جیب کی گرمی نے مجھے
پھر حواس بجا کرنے میں مدد دی اور میں اٹھ بیٹھی ——————
خدا خدا کر کے مکان پہنچے۔ اور سب روداد گھر والوں کو سنائی
یہ پوچھنے سے پہلے کہ مجھے چوٹ کہاں کہاں آئی ہے مجھ سے میری
والدہ نے بوکھلا کر پوچھا۔ روپیہ تو نہیں چھین لیا۔ وہاں کوئی روپیہ
تو نہیں رہ گیا" ۔ میں ان جملوں کی زہر آلود نوعیت سے اور اس
خود غرضانہ ذہنیت سے اسقدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگی اور قریب بیہوش ہو گئی۔

مجھ سے پانچسوں روپیہ کے نوٹ لے لیے گئے میرا علاج شروع ہو گیا۔ تکلیف تو۔ یقین ہے۔ کہ محض چند ہی روز باقی رہے گی۔ مگر اس۔ سچے دل سے چاہنے والے" کی بیوی کی شکل۔ اور بھیانک واقعہ کی یاد برسوں کیا آخری دم تک باقی رہے گی — ! ہ

عشق کی نیرنگیوں کو۔ حسن ہرجائی ! نہ پوچھ
حسن رسوا ہو رہا تھا عشق بس ! دیکھا کیا!

۱۳/ مئی سنہ ۱۹۳۰ء

گذشتہ شب میرے لیے کسی قدر غیر قابل فہم واقعات لیے ہوئے ثابت ہوئی —— سہ پہر ہی کسے کچھ سرگوشیاں ہو رہی تھیں گھر کا ہر آدمی مجسمہ راز بنا ہوا تھا۔ مگر اخفاء کے بار گراں کا متحمل نہ نظر آتا تھا۔ میں بھی متوجہ ہوئی۔ اور معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ دبے پاؤں میں والدہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچی اور چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ جو سنا قطعاً مضحکہ خیز اور ناقابل یقین تھا۔ گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ میری خالہ صاحبہ کا نواب عارف صاحب سے نکاح ہونے والا ہے۔ نواب صاحب کی عمر چالیس سال سے کسی طرح کم نہ تھی۔ میری خالہ مشکل سے اٹھائیس سال کی ہونگی۔

جو چیز بیحد پُر لطف تھی وہ یہ تھی کہ یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ نواب صاحب واپسی کب ہو کے حرم کتنے دن رہا جائے اور کب واپس آیا جائے۔ جس کو میں سمجھنے سے قاصر رہی۔ نواب صاحب کی امارت۔ طبیعت کی سادگی اور بوالہوسی کے والہانہ برتاؤ کی تعریف ہو رہی تھی۔ لیکن صورت شکل۔ عمر اور محبت کا کہیں تذکرہ نہ تھا۔ میری زندگی میں یہ ایک حاشیہ کا سین (منظر) تھا۔ جو نوعیت کے اعتبار سے میرے لیے بیحد دلچسپ تھا ــــ میں اس کو مشکل سے سمجھ سکی کہ جو یہ نکاح کا نیک معاملہ کیوں چھپایا جا رہا ہے۔ خیر۔ میں وہاں سے کھسک آئی ــــ

شب میں خالہ صاحبہ کو عروسی لباس پہنایا گیا۔ اور عطر اور لونڈر کی شیشیاں خالی کر دی گئیں۔ ــــ

میری خالہ کا نام عباسی تھا اور تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ بہت عقلمند مشہور تھیں ــــ عباسی خالہ کو بہت قیمتی اچھے اور نئے نئے زیورات پہنائے گئے جن کو میں نے ان کے پاس کبھی نہ دیکھا تھا۔ یقیناً عارف صاحب کے یہاں سے آئے ہوں گے! ــــ

الغرض عباسی خالہ باین تزک و احتشام مجھ سے ملنے آئیں اور مجھ کو میرے کمرے میں لیگئیں۔ اور بہت شفقت سے فرمایا "لیلیٰ! میں نواب عارف صاحب سے شادی کرتے جا رہی ہوں۔ تم اپنی والدہ کا خیال رکھنا"۔ یہ کہکر وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ دو ناک سے

مصنوعی آواز نکالکر رومال سے صاف کرنے لگیں اور مجھے فوراً گلے سے لگا لیا۔ میں خدا سے چاہتی تھی کہ وہ مجھے کافی مسکرانے کا موقعہ دیں اور دیکھ نہ سکیں کیونکہ اس ڈراما کے ایکٹینگ پر میں مشکل ہی سے اپنی ہنسی کو ضبط کر سکتی تھی۔ وہ گلے لگاکر ہدایات فرماتی رہیں جُدا ہونے کا اظہار ملال کرتی رہیں۔ اور میں مزہ لے لے کر مسکراتی رہی جب وہ علیحدہ ہوئیں تو میں باوجود اپنی پوری کوشش کے بھی اپنے چہرے کو رنجیدہ نہ بنا سکی۔ اور طرفہ یہ کہ بیساختہ میری زبان سے نکل گیا۔ "خالہ اماں کاہے کو رنج کرتی ہو۔ یہ تو خوش نصیبی کی بات ہے کہ گنہگارانہ زندگی سے نجات مل گئی۔ ان کو کہنا پڑا " ہاں بیٹی یہ تو ٹھیک ہے لیکن تم لوگوں سے چھوٹنے کا مجھ کو بڑا صدمہ ہے۔" میں نے خدا جانے کیوں فوراً کہدیا۔ " مجھ سے چھوٹنے کا آپ بالکل غم نہ کریں میں خود عنقریب آپ کی طرح اس سنت پر عمل کرنے والی ہوں۔" خالہ بولیں۔ " کیا؟ .... تم بھی کسی سے نکاح کے لیے تیار ہوگئیں۔" میں نے متانت سے کہا " جی ہاں! ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑگئے وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گئیں اور والدہ کو ساتھ لیکر آئیں۔ دونوں نے طرح طرح کے سوالات پوچھے میں نے نہایت اختصار کے ساتھ نیکی اور گناہ کے فلسفہ پر روشنی ڈالی۔ مگر ان کی حیرانگی بڑھتی رہی اور اُن کی دماغی حالت بہت نازک ہوگئی چپ ہوگئیں۔ آخرش عباسی خالہ نے ناپ تول کر فرمایا " بیٹی لیلی! میں تم سے اب نہیں چھپا سکتی۔ میں دولت ایمان کے لیے نکاح کر رہی ہوں اور ایک

دو ماہ کے اندر اندر پھر تمہارے پاس آجاؤں گی"۔ میں نے متعجب ہو کر پوچھا یہ کیسے ممکن ہے"؟ اماں جان نے فرمایا۔ "بالکل ممکن ہے۔ تم چھوکری ہو۔ کچھ نہیں جانتیں۔ میں نے تیرے باپ سے نکاح کر کے کیا پھل پایا۔ اب پچھتا رہی ہوں کہ سب روپیہ اور زیور لیکر ان کی زندگی ہی میں کیوں نہ نکل آئی۔ آج میں کتنی دولت مند ہوتی"! ان جملوں نے مجھ پر عجیب اثر کیا اور میں ایک گہرے فکر میں پڑ گئی .... عباسی خالہ نے کہا۔ بیٹی لیلیٰ! طوائف نکاح نہیں کیا کرتی۔ بلکہ وہ اس کو کھیل سمجھتی ہے یو سمجھو کہ عیاشی مرد شاہد بازی کرتے ہیں اور بعض طوائفین نکاح بازی کرتی ہیں۔ اور اس نکاح کے پردہ کے خطرات پر شطرنج کی بساط لگا کر اپنی آزادی سے کھیلتی ہیں۔ جو طوائف شہ کھا جاتی ہے وہ ماری جاتی ہے۔ اور جو اس بازی میں جیت جاتی ہے وہ ہمیشہ عیش کرتی ہے اور مکمل اور عقلمند طوائف کہلاتی ہے۔ تم کبھی اپنی والدہ جیسی غلطی نہ کرنا ورنہ تمہارا انجام اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ تم کو بجائے لڑکی کے لڑکے پیدا ہوں اور تم ان سے کچھ بھی نہ کما سکو۔ ان جملوں سے میں پھر گھبرا گئی اور خاموشی کے ساتھ سوچتی رہی۔ اب میری والدہ نے بھی اسی قسم کے تائیدی جملے کہے جن کو میں سنتی رہی۔ لیکن میرے سامنے میر صاحب کی تصویر آکر مجھکو لرزہ براندام کرتی رہی۔ میں عباسی خالہ اور والدہ کی معنی خیز اور طویل گفتگو کو سنتے سنتے اسقدر مبہوت اور پریشان ہوئی کہ چارپائی پر لیٹ گئی اور میں نے اپنا منہ چھپا لیا۔ میری دبی آہوں اور اعصاب کی بیتابو

حرکت کو خالہ اور اماں اپنی کامیابی کی دلیل سمجھیں اور رخصت ہوگئیں اب میں عالمِ تنہائی میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اپنے متوقع نکاح کے مسئلہ پر غور کرنے لگی۔ خدا جانے مجھے کتنی دیر لگی اور میں نے کیا کیا سوچا

ابھی اثنا میں اچانک عزیز صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور بغیر کچھ کہے سنے چارپائی پر خاموش بیٹھ گئے۔ میں پہلے سے لیٹی ہوئی تھی ان کی پیٹھ میری طرف تھی اور منہ دروازہ کی طرف تھا۔ اب میرے خیالات کے سمندر میں تلاطم بپا ہوگیا۔ ان کی دلکش صورت ان کی دل پر جادو کرنے والی خاموشی اور بے نیازی۔ ان کا دل میں کھب جانیوالا نشست و برخواست کا اندازہ اور قلب میں پیوست ہونے والی نگاہ نے اور جبر صاحب کی تصویر اور ان کے تقابل نے مجھے اور میری وسعتِ خیال کو غیر ہموار بنا دیا اور میں بحرِ تخیل کی سطح پر تموج کی نذر ہو کر گرداب میں پھنس گئی۔ خیالات کی بےچینیوں اور قلبی کیفیات کے متضاد تاثرات کو۔ اور قوتِ فیصلہ کی بےبسی کے انقباض کو نہ برداشت کر سکی۔ در خصائی تفہیم کے تزلزل سے بے قابو ہو کر اٹھی اور عزیز صاحب پر گر پڑی اور میں نے ان کو اپنی بے قاعدہ آغوش میں لے لیا ——

—— لیکن۔ ! لیکن ! جب انھوں نے مجھے نہ سنبھالا ! ——

—— آہ کتنا عجیب ہے یہ خاموش انسان ! —— تو بس پھر —— بے قابو تو تھی ہی —— چارپائی پر گر پڑی۔ مگر میرا جسم عزیز سے

اب بھی ٹس سے مس ہو کر مجھ کو برخار رہا تھا۔ بلکہ بربار رہا تھا۔ ستم ظریف عزیز اب بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ جس طرح بیٹھا تھا بیٹھا رہا۔ جدھر رُخ تھا ادھر ہی رہا۔ اس بے رُخی نے نمکپاشی کی۔ برق مس نے حدت پیدا کی اور میں آتش حسیات میں جلنے لگی۔ دبی آہ کا دھواں نکلنے لگا۔ جب سینہ کے آتشکدہ میں جذبات کے گھٹے ہوئے شعلے اٹھنے لگے تو میں پھر اُٹھ گئی اور میں نے چارپائی پر گھٹنوں کے بل ہو کر اس خاموش ہستی کی کمر کو اپنے سینہ سے لگا لیا ارادہ کیا کہ اپنے ہاتھ ان کے سینہ پر لیجا کر اس یخ بستہ انسان کو نذر آتشِ دل کر دوں مگر نہ کر سکی! —— وہ نہ پگھلنا تھا نہ پگھلا! اللہ ری بے کسی اور عورت کی بے بسی! میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میرے حواس منتشر تھے۔ میرا دماغ ماؤف تھا۔ میرا قلب مفلوج تھا۔ مجھے انسانی ہمدردی کی! خلوص کی! مشورے کی سخت ترین ضرورت تھی۔ مگر عزیز! ہمہ تن عزیز! اپنے قلب کی آنکھوں کو بند کیے ہوئے اب بھی خاموش بیٹھا تھا —— اب میری شانِ نسوانی کو ٹھیس لگی اور میں نے چاہا کہ میں اس پتھر کے کلیجہ والے انسان کو طعنوں کے پتھروں سے ٹکرا دوں اور ملامت کی سنگین دیواروں سے بجڑا دوں مگر میں محض اتنا کہہ سکی۔ "عزیز..... صا..... حب!

انھوں نے خفیف جھرجھری لیکر کہا۔ "کیا میں آپ کی کبھی کوئی خدمت کر سکتا ہوں"؟ میرے لہجہ میں کرب والتجا کے ساتھ وقتیہ زور بھی تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ سکتے تھے۔ ہر شخص سمجھ سکتا تھا۔ وہ

سکتے یا نہیں سمجھے۔ مگر جواب کسقدر غیر متوقعہ اور بے محل تھا اس اسکو بھی اُس کی شانِ محبوبیت پر محمول کرنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ لفظ "کمبخت" اُن کی شاعری تھی۔ ممکن ہے کہ اس میں لطیف جذبات بھی پنہاں ہوں مگر میرے لیے یہ لفظ دشنہ و خنجر سے کم نہ تھا کیونکہ مجھے فوراً شانت کی اور تسلی کی ضرورت تھی۔ مگر وہ لفظ کمبخت فرما کر ابہام کی چھری چلا رہے تھے جس نے کلیجہ کو چیر کر دماغ پر بھی وار کیا۔ اور اور میرا تمام نظام عصبی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا

میں پھر چارپائی پر گر پڑی۔ اور چپ ہو گئی۔ اور پی گئی۔ بلکہ اشکِ خونیں کا جام غٹ غٹا گئی۔ میں نے اب ارادہ کیا کہ حاضر کو غائب سمجھوں اور قلبی اضمحلال اور جذبات و خیالات کے انتشار میں کچھ سکون پیدا کروں۔ مگر میں نے دیکھا کہ اب عزیز صاحب اٹھے اور میری طرف رخ کیا۔ میں الٹی لیٹی تھی۔ انھوں نے بجز تکلیف۔ تذبذب۔ کچھ وسوسے اور دبے ہوئے جذبات کے ساتھ میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ جس سے میرے تمام جسم میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ مجھے توقع ہوئی کہ وہ اب کچھ بولیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ شانے سے ہاتھ اٹھا اور سر کے بالوں پہ پہنچا اور میرے دماغ میں برقی لہر دوڑانے لگا۔ میں نے اب ارادہ کیا کہ کروٹ لوں اور ان کے چہرے کے تاثرات اور ان کی نظر کی نوازش ریزیوں سے اکتسابِ سکون کروں مگر ڈر گئی مبادا وہ بدل جائیں اور پھر اپنی پہ آ جائیں۔ میں لیٹی رہی۔ بے حس و حرکت لیٹی رہی اور توقعات کے امکان پر تذبذب کے سمندر میں

غوطے لگانے لگی ۔ مجھے کچھ کچھ یقین ہو گیا تھا کہ میری خاموشی اور میرا ضبط ہی میرے کام آسکیگا ۔ اور عزیز صاحب اب معمہ نہ بنے رہیں گے ——— چند سکنڈ کے بعد ان کا ہاتھ بھی میرے سے جدا ہو گیا ۔ اور میں پھر متضاد جذبات کی روح خلش میں مبتلا ہو گئی ——— یہ کیفیات اور عالم گو مگو طاری ہی تھا کہ عزیز صاحب نے اپنے خاص انداز میں پوچھا ۔ "میں ۔ کچھ ۔ پوچھنا ۔ چاہتا ہوں۔" میں نے اُلٹا لیٹے ہوئے ہی بولنا مناسب سمجھا اور کہا "پوچھیے" وہ خاموش ہو گئے اور میں اب لفظ "پوچھنا" کی تفسیر ۔ نوعیت ۔ اور اپنی توقعات کی وابستگی پر غور کرنے میں مشغول ہو گئی ۔ شاید دو تین منٹ کے بعد انھوں نے پوچھا ۔ "کیا آپ کی عباسی خالہ کا آج نکاح ہونے والا ہے" ؟ میرے قلب مجروح پر ایک ضرب لگی اور میں نے تکدر آمیز لہجہ میں کہا ۔ "ہاں ! مگر ...." اب وہ پھر خاموش ہو گئے ۔ میں نے صبر و ضبط اور انتظار سے کام لیا ۔ چنانچہ ایک منٹ کے بعد انھوں نے فرمایا "آپ کا نکاح کب ہوگا؟ میں نے ارادہ کیا کہ اُٹھ کر بیٹھ جاؤں اور انتہائی اشتیاق سے کچھ پوچھوں ۔ مگر ڈر گئی کہ کہیں پھر حضرتِ خاموش بت خاموش نہ بن جائیں ۔ آخر شرمیں نے ویسے ہی لیٹے ہوئے پوچھا ۔ "کس سے" ؟ خدا جانے کیوں ۔ بیحد برجستہ بولے ——— "یہ میں نہیں پوچھتا ! میں نے کہا ۔ مگر میں تو پوچھتی ہوں" ! پھر بھی انھوں نے چند سکنڈ کے بعد کہا ۔ "میں تو ۔ کب ۔ پوچھتا ہوں ! میں نے معاً کہا "مگر میں ۔ کس سے" ؟

خدا جانے کیوں بیحد برجستہ بولے ۔" یہ میں نہیں پوچھتا" ! میں نے کہا۔ "مگر میں تو پوچھتی ہوں" ! پھر بھی انھوں نے چند سکنڈ کے بعد کہا۔ "میں تو ۔ کب پوچھتا ہوں ! میں نے معاً کہا۔" مگر میں ۔ کس سے پوچھتی ہوں" ۔ انھوں نے خلاف توقع ذرا روشن پہلو لیے ہوئے کہا۔ "کس سے کے سوال کو کسی سے اور خصوصاً مجھ سے مت پوچھو ۔ اگر پوچھنا ہی ہے تو دل سے پوچھو" ۔ اب میں خاموش ہو کر سوچنے پر مجبور ہو گئی ۔

شائد میں ایک یا دو منٹ یا اس سے کچھ زیادہ دیر تک اس معاملہ کی نوعیت پر غور و فکر اور تعجب کرتی رہی استفسار کی غرض و غایت کو نہ سمجھ سکی ۔ اب میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر ہی سمجھنے کی کوشش کروں ۔

لیکن ! ۔ لیکن ! جیسے ہی میں نے کروٹ لی ۔ عزیز صاحب غائب تھے ۔ میں حیران تھی کہ کسقدر خاموشی اور آہستگی کے ساتھ گئے کہ مجھے علم تک نہ ہوا ۔ اُن کے غائب ہونے سے پہلے تو ۔ میرے حواس بجا نہ رہے ۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اُن کا غائب ہونا ہی میرے حضوری لیے قدرے دماغ کی حاضری کا باعث بنا اور میں گگلے کے کمرے اور سو قینوں کے انتظار اور اپنی اس غیر حاضری کے بے محل ہونے پر غور کرنے لگی ۔ یہاں تک کہ میرا خیال اور دل میر صاحب کی

خیالی تصویر سے باتیں کرنے لگا جو اس عرصہ میں اکثر و بیشتر میرے روبرو آتی رہی تھی ــ میں نے بدقت تمام ـ نکاح کے ارادے کو قائم رکھنے میں ہی موجودہ دماغی کوفت اور قلبی انتشار کے لیے سفر کی صورت دیکھی ـ اور میر صاحب کی خیالی تصویر کے گلے میں میرے خیالی ہاتھوں نے پھولوں کا ہار ڈالدیا ـ جس سے میں خود بخود مسکرانے لگی اور بہت کچھ ہوش میں آگئی !

یہ سب عالم خیال کی دل خوش کن فضا تھی ـ اور میں سنبھلتی جارہی تھی حالانکہ کوئی خوشی آمیز واقعہ درحقیقت نما نہ ہوا تھا ـ محض ایک تصور تھا ـ

خیال انسانیت کا شہنشاہ ہے ـ بڑی سے بڑی غطرت رکھنے والا بھی اس کی غلامی کرنے پر مجبور ہے ـ خیالات ہی خواہ ان میں اصلیت ہو یا نہ ہو ـ انسان کو دفعتاً کچھ خوش بلکہ سرشار بنا دیتے ہیں ــ اور خیالات ہی ـ خواہ ان میں اصلیت کچھ بھی نہ ہو ـ انسان کو اچانک کبیدہ خاطر ـ مضمحل بلکہ بیمار بنا دیتے ہیں ـ خیالات ہی ــ خواہ حقیقت کچھ ہی ہو ـ انسان کو متکبر یا مستغنی بنا دیتے ہیں ــ اور خیالات ہی ـ خواہ واقعات برعکس نوعیت رکھتے ہوں انسان کو عاجز اور خاکسار بنا دیتے ہیں " ہر شخص اپنے ہی خیال سے خوش ہے اپنے ہی خیال سے خوش ہے اپنے ہی خیال سے رنجیدہ " ـــــ

ـــــ ہر شخص اپنے ہی خیال سے بڑا ہے اور اپنے ہی خیال سے

چھوٹا "

"اپنے ہی خیال سے خوش نصیب ہے اور اپنے ہی خیال سے بدنصیب ہے"

میں ان فلسفیانہ خیالات میں مستغرق ہی تھی اور باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ عزیز صاحب پھر کمرے میں رونما ہوئے اور میرے مقابل خاموش کھڑے ہو گئے۔ میں بھی خالی الذہن ہو کر اُن کا منہ تکنے لگی جو میرے لئے ہمیشہ کافی دلکش رہا ہے۔ اُن کی نگاہیں جھکی ہوئی اور نیچے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ مگر نہ کہہ سکتے تھے۔ اب میرے خیالات کے عالم میں پھر طوفاں مچا! اور میں کچھ کھوئی سی گئی۔ میں نے بمنت کہا "خدارا عزیز صاحب یا تو بولا کیجئے یا سامنے ہی نہ آیا کیجئے"۔ انھوں نے آخری جملے کو شاید سنے بغیر ہی کہہ دیا۔ لیلیٰ! میں ایسے جذبات کا حامل ہوں کہ جن سے میری زبان گنگ ہے لیکن جن کے لیے میرا سینہ تنگ ہے۔ پھٹا چاہتا ہے مگر میری فطرت اس پر قابو پائے ہوئے ہے .... خدارا تم مجھے بتا دو کہ تمھاری شادی کب ہوگی؟ اور ....! میں نے چڑ کر اور ایک فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ مگر خدا جانے کہاں تک سچ کہا "میری شادی کبھی نہ ہو سکیگی"۔ خدا جانے ان جملوں میں کیا تھا کہ عزیز صاحب بت بن گئے اور اُن کے چہرے پر عجیب آثار آنے اور جانے لگے۔ میں نے اُن کو سمجھنا چاہا۔ مگر اس لیے نہ سمجھ سکی۔ کہ ان کا کردار اس قدر

مجیر العقول ہے کہ اُن کے کسی لفظ اور ان کی کسی حرکت یا اُن کے چہرے پر کسی خاص اثر سے کوئی صحیح نتیجہ مرتب کر لینا قطعاً نا ممکن ہے۔ وہ کچھ دیر تک ساکت و صامت کھڑے رہے اور میں نے بھی اُن کا ساتھ دیا لیکن چند منٹ کے بعد انھوں نے ایسی دل کو برباد دینے والی اور پار ہو جانے والی نظر اٹھائی اور مجھے ایسے انداز سے دیکھا کہ میں کانپ اُٹھی۔ مگر بیحد مسرور ہوئی۔ اب وہ آہستگی کے ساتھ کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور میرے لیے ایسے تأثرات چھوڑ گئے جن سے میں کئی منٹ تک پیچھا نہ چھڑا سکی ــــــــــــ

ــــــــــــــــــــ

خدا خدا کر کے میں کمرے سے باہر نکلی۔ والدہ کے کمرے میں گئی وہاں اُن کو نہ پایا۔ تب میں خالہ کے کمرے میں گئی ان کو وہاں نہ دیکھا مجبور ہو کر اپنے گانے کے کمرے میں آئی۔ جیسے ہی حاضرینِ محفل پر نظر ڈالی۔ میر صاحب کی صورت نظر آئی۔ اور میری خیالی دنیا پھر رنگین اور تاریک نظر آنے لگی۔ میں نے کبھی میر صاحب کو انتہائی کیف پرور آنکھوں سے دیکھا اور کبھی انتہائی کدورت بھری انکھوں سے دیکھا۔ جس سے وہ یقیناً متعجب اور متاثر ہوئے۔ لیکن مجمع میں وہ یا میں ایک دوسرے سے کہہ ہی کیا سکتے تھے! میں آداب بجا لا کر بیٹھ گئی اور حواس کو مجتمع کر کے گانے لگی۔ اور میر صاحب کی طرف سوائے اُٹھتی ہوئی نظروں کے پہلی سی محبت بھری نظروں سے نہ دیکھ سکی۔ جو چیز مجھے زیادہ حیران بلکہ پریشان بنا رہی تھی کہ عزیز صاحب اس

مجمع میں موجود نہ تھے۔ مگر اُن کی تصویر اسقدر وزنی جذبات کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی کہ میں مشکل سے ہی اُن کی متحمل ہو سکتی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری قلب ناہیت (ہپنا ٹزم یا مسمیریزم) کے ذریعہ کر دیگئی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ میر صاحب اُٹھکر جانے لگے اب میرے سمندِ خیال پر تازیانہ پڑا۔ اور میں کھڑی ہو کر آگے بڑھی۔ لیکن ان کو نہ پکڑ سکی اور نہ کچھ کہہ سکی۔ انھوں نے بھی نہ پلٹ کر دیکھا نہ کچھ کہا۔ اور چلے گئے ——— ان کو جاتا دیکھکر ایک دل جلے نے آوازہ کس دیا "وہ گئے۔ بھئی اب گانے کا مزہ بھی گیا" — میں چونک پڑی اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ گایا۔ مگر خراب۔ با دل ناخواستہ۔ اُکتا اُکتا کر رفتہ رفتہ سب لوگ چلے گئے۔ اور میں بھی ان موذیوں سے پیچھا چھڑا کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور خیالات کے بحر بیکراں میں غرق ہو گئی ——— کوئی ایک بجے کے قریب میری والدہ ماموں اور ملازمیں آئے مگر خالہ نہ آئیں —— میں آج کھانا بھی نہ کھا سکی۔ اور گھنٹوں سوچتے سوچتے ہی۔ خدا جانے کب۔ سوگئی۔ اور واقعی شب بھر سو بھی سکی یا نہیں!

۲۷/مئی سنہ ۱۹۳۰ء

تین آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ جن میں ایک بہت نو عمر بلکہ

کم عمر تھے مشکل سے اٹھارہ سال کے ہوں گے آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ بلا کی گرمی تھی۔ ہوا بند تھی۔ میں سنگار سے فارغ ہو کر باہر صحن میں جانا چاہتی تھی۔ لیکن ان تین آدمیوں کے آجانے سے اب نہ جا سکی تھی نوعمر بالکل نو وارد تھا۔ باقی دونوں آدمی پہلے بھی کئی بار آچکے تھے۔ پان پیش کیا گیا۔ اور تھالی میں نوعمر صاحبزادے نے پانچ روپیہ کا نوٹ کچھ ایسے انداز سے رکھا کہ جس سے میری توجہ زیادہ منعطف ہوئی۔ نوٹ تھالی کے حوالہ کرنے کے بعد مجھ کو اس نوعمر نے للچائی ہوئی مگر گھبرائی ہوئی نظر سے دیکھا۔ جس کا میری مسکراہٹ نے خیر مقدم کیا۔ مجھے شرارت سوجھی اور میں نے آنکھ مار دی۔ میرا تجربہ ہے کہ آنکھ مارنے سے نوعمر ہمیشہ گرفتار ہو جاتے ہیں مر مٹتے ہیں اور مرتے ہوئے پانی بھی نہیں مانگتے۔ چنانچہ یہ صاحبزادے فوراً سمجھ بیٹھے کہ میں ان پر ریجھ گئی۔ چونکہ ان کا رنگ روپ اچھا تھا۔ نقش و نگار خاصے تھے۔ اور شاید خود کو حسن پرستی کا تختۂ مشق متصور کرتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ہم کو ہر شخص چاہنے پر مجبور ہے خیال کرتے ہونگے کہ جب مرد ان کے حسن پر فریفتہ ہو جاتے ہیں تو عورتیں تو ضرور ہی ان کے عشق میں فوراً مبتلا ہو جائیں گی۔ یہ بھی سوچا ہو گا کہ شریف عورتوں کو ان سے عشق لڑانے میں ممکن ہے حجاب ہو۔ مگر طوائف تو ضرور حسن پرست ہوتی ہے آزاد ہوتی ہے۔ فوراً عاشق ہو جائیں گی اور بقول کسی کے غبے ان کے گہرے ہو جائیں گے۔ ایسے ہی چند زنانہ طرز کے حسین مرد بھی یہ یقین رکھکر تشریف لاتے ہیں کہ طوائف ان کے خوبصورت چہرے کو

پسند کرتے ہی عشق کا اظہار کر دیگی ۔ حالانکہ ان کے اور ہمارے مشاہدے بالکل بر عکس ثابت ہوتے ہیں ۔ مگر وہ اپنی بیوقوفی سے آخری وقت تک اس خیال کو اپنی آغوش میں لیے رہتے ہیں اور منہ کی کھاتے رہتے ہیں عیاشی میں قطعاً ناکام رہتے ہیں

ایک طوائف کبھی اس چہرے کو پسند نہیں کرتی جس میں نسوانی حسن کی کوئی جھلک ہو ۔ مرد کی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کو ہمیشہ وحشت ہوتی ہے ۔ چکنے گالوں سے وہ سخت نفرت کرتی ہے نازک اُس کو ہمیشہ بھونڈی معلوم ہوتی ہے ۔ نازک ہاتھ پاؤ اس کو کبھی بھلے نہیں معلوم ہوتے ۔ مرد کی پتلی کمر پر اُس کو ہمیشہ تمسخر سوجھتا ہے ۔ گورے چٹے رنگ سے وہ کبھی مرعوب نہیں ہوتی لانبی اور نازک انگلیوں کو وہ کم نگاہی سے دیکھتی ہے ۔ نازک جسم اس کی نگاہوں میں کبھی نہیں جچتا ۔ خوبصورت بالوں اور سر کی مانگ کو عورت کبھی بھولے سے بھی پسند نہیں کرتی ۔ مرد کے زنانہ ناز و انداز کو عورت ہرگز خاطر میں نہیں لاتی

یہ بتلانا بھی واقعی مشکل کہ پھر عورت کس قسم کے مرد کو پسند کرتی یا چاہتی ہے میں کبھی تسلیم نہ کرونگی کہ عورت مرد کے چہرے کے نقش اور مردانہ رنگ و روپ سے بالکل بے نیاز ہے ۔ لیکن یہ بھی مجھے تسلیم نہیں ہے کہ خراب صورت اور بھدے رنگ کے مرد کو عورت محض بد صورتی اور رنگ کی وجہ سے اپنی محبت سے محروم کر دیگی ۔ حقیقت یہ ہے کہ چہرہ عورت کے لیے انتخاب کے مسئلہ میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے ۔ اولین شئے جس پر عورت کی نظر جاتی ہے وہ مرد کی مردانہ وجاہت ہے ۔ دوم مرد کی

نگاہ کی طاقت اور لطافت ہے ۔ آنکھیں خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی۔ عورت بہت کم اس کی پرواکرتی ہے ۔ میرے مشاہدے میں آیا ہے۔ بعض مرد کی نگاہوں میں ایسی غضب کی برقی طاقت ہوتی ہے کہ پہلی ہی نظر بس میں بیچین ہوگئی ہوں! اور بعض مرد کی نگاہ میں اسقدر لطافت ہوتی ہے کہ ان میں اُن کے جذبات کی صداقت نمایاں ہوتی اور مرد کی بڑی پرزور سفارش کرتی ہے ۔ سوم مرد کی طرز گفتار اور اس کا لب ولہجہ ہے زنانہ لب ولہجہ اور کمزور آواز کے مرد کو عورت بہت کم قابل التفات سمجھتی ہے ۔ چہارم مرد کی شریف النفسی عقلی قوت ۔ سنجیدگی اور بامو قعہ ظرافت کی استعداد ہے جو ہر عورت کے دل کو تسخیر کرنے کے لیے کافی ثابت ہوسکتی ہے میرا خیال ہے کہ عورت کے لیے دائمی نباہ کے واسطے اس خصوصیت کو بیحد ضروری اور جزو لاینفک کہا جاسکتا ہے ۔ پنجم مرد کا طرز نشست وبرخاست اور مجلسی علم ہے ۔ غربت وامارت ظاہری شان وشوکت اور مرد کی دیو پیکری کو عورت کی پسندیدگی سے کوئی تعلق نہیں ۔ البتہ شجاعت دلیری اور جرأت وہمت ایسی صفات ہیں کہ جنسے عورت ضرور متاثر ہوتی ہے اور محبت کا گہرا اثر لیتی ہے ۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ موٹاپے اور پہلوانی کو بہادری سے کوئی خاص مناسبت نہیں نفسیاتی نقطۂ نظر سے تو یہ کہا جائے گا کہ ہر عورت کی ۔ ہر مرد کی طرح ۔ پسند جدا ہوتی ہے ۔ اور اپنی ذاتی خصوصیات کی بناء پر ہر عورت ایک مخصوص قسم کے مرد کو پسند کرتی ہے ۔ اور اسی سے محبت کرسکتی ہے ۔ لیکن سب سے بڑی شے جو ہر عورت کو مرغوب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت

کے صحیح جذبات کا احترام کیا جائے اور اُس کی نظری خواہشات اور لذات کو ترجیح دیجائے اور ــــــــ "مرد اپنی خوشی اور مسرت کو عورت کی مسرت اور راحت میں تلاش اور محسوس کرے گا۔ نہ کہ اپنے جذبات کا اس کو تختۂ مشق بنالے اور اُس کے جذبات کی پروانہ کرے!

ــــــــــــــــ

ہاں! تو صاحبزادے بہت جلد رخصت ہو گئے اور دل میں یہ یقین ساتھ لے گئے کہ لیلیٰ ان پر عاشق ہو گئی ہے۔ شب کے دس بجے تنہا تشریف لائے۔ میرے شریک شب ہونے کو تیار ہو بیٹھے اور ایک بجے شب تک چھپتے چھپاتے نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ ــــــــ تخلیہ میں میری طوائفانہ گفتگو اور بے حجابی نے ان کو بوکھلا دیا اسقدر پریشان اور مضمحل ہوئے کہ دل دھڑکنے لگا۔ اور کئی بار میری چھاتی سے اس طرح لگے کہ ــــــــ مگر یہ سب بھی ان کے حواس درست نہ کر سکا۔ میں نے جان جان کر ان کو ستانا اور پریشان کرنا شروع کر دیا۔ جس سے بچنے کے لیے انھوں نے سر کے درد کا بہانہ تراشا۔ جس پر میں نے قہقہہ لگایا اور صاحبزادے خفیف اور کھسیانے ہو کر شاید سو گئے ــــ

ــــــــــــــــ

سو کر اٹھنے پر میری طمع کی رگ پھڑکی اور میں نے چند عاشقانہ فرائض انجام دینے شروع کر دئے ــــ اور محبت کی نشانی کے لیے ان کی قیمتی گھڑی کھینچ لی۔ میں اُن کے چلے جانے کے بعد کئی منٹ تک دل میں

ہنستی رہی ۔ لیکن اپنی زیادتیوں اور ان کے والدین کی توقعات کے بھیانک مستقبل پر افسردہ خاطر اور غمگین بھی کئی بار ہوئی اور گھڑی کو ساری کی نذر کر کے ۔ میں چین کے ساتھ سو گئی ۔ میرے خوابوں کی دنیا ہمیشہ پریشان حال رہی ہے ۔ خواب ستاتے رہے ۔ اور بیداری کے بعد خیالات نے اور بھی متفکر بنا دیا ۔ اور میں حسب سابق اپنی حیات کے ایک مستقبل پر کبھی کوئی اچھی روشنی نہ ڈال سکی ! سو کر اٹھی ہی تھی کہ اُن کا عاشقانہ خط نوکر کے ذریعہ موصول ہوا ۔ جس کو پڑھ کر کافی ہنسی اور خاصہ دل بہل گیا ! —

۱۳/جون ۱۹۳۰ء

دنیا کے خوش فکرے میرے یہاں فرح سامانی کی فکر میں آتے ہیں اور دنیا کے بے فکرے خوش فکری کی تلاش میں نازل ہوتے ہیں ۔ لیکن کوئی متفکر و متفکر افکار کی تلاش میں دانستہ میرے یہاں نہیں آتا ۔ یونہی ایک گمان سا ہے کہ شاید عزیز صاحب موخر الذکر حیثیت سے تشریف لاتے ہیں ۔ میر صاحب کے متعلق کوئی رائے قایم کرنا اندنوں بے حد مشکل ہوتا جا رہا ہے ۔ ورنہ ان کو میں نے ہمیشہ اپنا ہم خیال سمجھا ہے ۔

میرا خیال ہے کہ طوائف کا مکان فرحت کی دوکان ہے اور ہر شخص حسب حیثیت مسرت کا سامان خریدنے آتا ہے لیکن غم خریدنے کوئی نہیں آتا! بعض احمق آتے تو ہیں درحقیقت عیاشی کے لیے۔ لیکن اپنے عیش کو غم میں دانستہ تبدیل کر کے ہائے وائے کرنے لگتے ہیں ایسے لوگ طبیعت کے کمزور ارادہ کے کچے اور جذبات پرست طماع اور ڈھنڈورے خود غرض ہوتے ہیں۔ پہلے حلوائی کی دکان پر سجی ہوئی مٹھائی دیکھنے آتے ہیں اور سونے کے ورقوں کی چمک سے بیتاب ہوتے ہیں کوئی خریدنے آتے ہیں پھر لڈو خریدتے ہیں۔ پیڑے پر رال ٹپکاتے ہیں۔ شیرینی کے ساتھ ساتھ نمکینی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ باسی مٹھائی اور سڑی ہوئی شیرینی کی تلخی کو بدرقہ سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر سڑی ہوئی چیز میں نشہ ہوتا ہے اور یہ طبعاً چٹورے ہوتے ہیں چاہتے ہیں چٹخارے لیکر! نتیجتاً نشہ ہوجاتا ہے۔ اور یہ جھومنے لگتے ہیں سڑی ہوئی کھاکر سڑی ہوجاتے ہیں۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں اور جادہ مستقیم سے اسقدر بہکتے ہیں کہ آپے سے باہر ہوکر تمام دکان خریدار بنتے ہیں۔ اور اس شیرینی اور نمکینی کے سودے میں جس پر سیکڑوں مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ اپنی ساری پونجی۔ لگادیتے ہیں عزت اور صحت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اور اب چاہتے ہیں کہ حلوائی کو بھی خرید لیں۔ نہ خرید سکیں تو قبضہ جارحانہ کرلیں! سب مٹھائی ہڑپ نہ کرسکیں تو بھنگ کھاکر اناپ شناپ کھاتے ہیں اور کبھی مکوڑوں کو بھی ہضم کر جائیں۔ جب ان کو قے ہوتی ہے تو

دست بھی ساتھ آتے ہیں کلیجہ میں مروڑ ہوتا ہے اور کچھ دن بعد تپ محرقہ کے مریض بنتے ہیں۔" چاندی سونے کو پھونک کر کشتے کھاتے ہیں اور خود بھی کشتہ ہو کر رہ جاتے ہیں"

لیکن ستم یہ ہے کہ فرحت کی دکان کی ساری مٹھائی جب یہ نہیں خرید سکتے تو کلیجہ تھام کر آہیں بھرتے ہیں۔ اور جب دکان کی مٹھائی دوسروں کو بھی حسب حیثیت کھاتے دیکھتے ہیں تو ان کے کلیجہ پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ اب رونے بیٹھتے ہیں۔ وہ بھی سر پکڑ۔ دھاڑیں مار مار کے پیٹ پیٹ کر۔ ان کی چیخ و پکار سن کر

پڑوس کے اہل بینش ان کو "دیوانہ" کہہ دیتے ہیں اور یہ نہ کہیں تو کیا کہیں! لیکن یہ کم عقل دیوانگی کے لفظ تفسیر کرتے ہیں دیوانگی کے لفظ کو عشق کا مترادف سمجھ کر عاشق کا معزز خطاب اپنے سے منسوب کر لیتے ہیں۔ اب عاشق بن کر ان میں بعض تو دوسرے مٹھائی کھانے والوں سے مار پیٹ کر کے کسی جرم میں ماخوذ ہو ہو کر کیفر کردار کو پہنچ کر عشق سے دست بردار ہوتے ہیں بعض نحیف الجثہ فدائے ثقہ اور لکھے پڑھے ہونے کی وجہ سے خواہ مخواہ غم میں گھلنے لگتے ہیں اور نحیف و نزار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ تعلیم یافتہ عاشق ہیں اور عاشقی کو شاعری کے بغیر نامکمل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مٹھائی کی قیمت نہ دے سکنے اور مٹھائی نہ کھا سکنے کے غم میں دھواں دھار شاعری کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے ۔ مزے وصال کے مدت ہوئی اٹھائے ہوئے

اور اس کو ہجر و فراق۔ کے نام سے تعبیر کر کے اپنی قابلیت کا سکہ جماتے ہیں۔ لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ فرحت کی دکان پہ جانے سے اور مٹھائی کھانے سے انہیں کون منع کرتا ہے۔ ہاں۔ پیسہ کی ضرورت ہے جو ان کے پاس کم ہو جاتا ہے تب ہی یہ چلاتے ہیں۔ لہذا ان کو محض یہ کہنا چاہیئے کہ

نہیں ہے جیب میں پیسہ تو رستے میں گزرے ۔ کتنا زمانہ مٹھائی کھائے ہوئے

بھلا حلوائی خود ان کو آنے سے کب منع کرتا ہے۔ البتہ اپنی جیب گرم کر لے کا وہ ہنستی بلکہ مستحق ہے کیونکہ مفت خوری کو روا رکھتے تو کھائے کہاں سے! لیکن یہ شاعر عاشق صاحب تو جیب و دامان کو پہلے ہی چاک کر کے سب مال و متاع کھو بیٹھتے ہیں اب جائیں تو کیسے؟ کھائیں تو کیونکر؟ شیرینی کے بجائے غم کھانے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان کو بیکاری ہے کچھ کھانے کو چاہیئے۔ لہذا غم کو ہی غذا سمجھتے پر راغب اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے عاشقوں کی ستم ظریفی ایک یہ بھی ہے کہ فرحت کی دکان سے دوہرے "جائز مٹھائی کھانے والے" خریداروں کو یہ کوستے ہیں۔ بدنام کرتے ہیں۔ جائز کھانے والے ہیں ان کو اس لیے سمجھتی ہوں کہ وہ زیادہ دام دیتے ہیں اور کم کھاتے ہیں۔ لیکن کم مایہ عشاق ان سے جلتے ہیں اور ان کو رقیب روسیاہ کا خطاب دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ حلوائی کی نظروں میں ہمیشہ سرخرو رہتے ہیں۔۔۔ اور لطف یہ ہے کہ رقیب روسیاہ سے یہ کمزور طبع عشاق ڈرتے بہت ہیں بیٹھ پیچھے

سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر سامنے آنے کے خیال سے ان کی نکلتی ہے
چنانچہ ایک "مغل بچہ" شاعر فرماتا ہے ؎

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
ہم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے لے اختیار حیف

ان کمزور عاشقوں کا مشغلہ جدت طرازی ہو جاتا ہے انھوں نے ہمارے یہاں کے چوکیداروں یا ملازمین کو دربان کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ یہ عشاق رقیبوں سے زیادہ ان دربانوں سے ڈرتے ہیں۔ ان سے ڈرتے ہیں۔ ان سے خوب مار کھاتے ہیں پھر بھی ان کے قدم لیتے ہیں اور منت خوشامد کرتے رہتے ہیں ان کی اکثر جیب خالی دامان وجیب چاک اور منہ پر خاک ہوتی ہے اور دربان کی خوشامد اور منت اور ان سے مار کھانا ان کی عادت ثانیہ ہو جاتی ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے
دے جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

ان شعرا کے دیوان شایع ہو جاتے ہیں اور مرد ان کو شوق سے

پڑھتے ہیں اور بجائے ان تخیلات کی مذمت کرنے کے جدت طرازی اور شیوہ بیانی بلکہ جادو بیانی کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی کسی عورت کو ان کے دیوانوں کی تعریف کرتے نہیں دیکھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس میں صیغۂ تانیث تو ظالموں نے روا ہی نہیں رکھا تھا۔ اور پھر جو کچھ کہا اپنے لیے کہا۔ عورت کے لیے کبھی کچھ نہ کہا۔ جو چاہے کہو تم کو اختیار ہے با مرد ہو مقتدر رہو! ۔ با اختیار رہو! ہم کو ہمیشہ ظالم۔ قاتل اور بے وفا کہہ کر کوسا کیے اور اب تک بدنام کرتے ہیں۔ اور خدا جانے کب تک اتہام رکھتے رہیں گے۔ ظلم تو یہ ہے کہ ان کو یہ تسلیم ہی نہیں کہ عورت بھی محبت کر سکتی ہے! محبت اور عشق کو وہ محض مردوں کا موروثی حق سمجھتے ہیں۔

جذبات کا جہاں تک تعلق ہے وہ محض مرد کی ذات کو متصف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ۔ ہمدردی اور محبت کے جذبات کا جہاں تک تعلق ہے۔ نفسیات ہی نہیں بلکہ مشاہدات اور واقعات شاہد ہیں کہ عورت میں ان دونوں جذبات بمقابلہ مرد کے کہیں زیادہ موجود ہیں اور وہ مرد کی بہ نسبت ان جذبات کو کہیں زیادہ صحیح طور پر استعمال کرتی ہے۔ ہماری مظلومیت اور ہمارے ہی اوپر ستم ظریفی کی یہ ادنیٰ مثال ہے کہ دیوان کی انھیں خود غرضانہ اور غیر منصفانہ غزلوں کو ہمیں ہی دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ پڑھو ہی نہیں بلکہ ان کے سامنے بیٹھ کر کھڑے ہو کر گاؤ بھی!

اور اپنے ہی خلاف اور سراسر کذب و افترا پر رقص بھی کر دو! ان ظالم مردوں کو کیا کہیے۔ کم بخت اس حکم کی تعمیل ہماری کمزوریوں اور بے بسی کے

ناجائز فائدہ اٹھا کر زر کا لالچ دیکر کراتے ہیں۔ اگر یہ لالچ نہ ہوتا تو کوئی عورت ان خلاف واقعات جذبات سے بھری ہوئی غزلوں کو نہ گاتی۔ بلکہ مردوں کا منہ چڑاتی اور ممکن تھا نوچ ڈالتی۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان مردوں کی ہمت بھی نہیں پڑتی کہ وہ ان شریف عورتوں سے ان غزلوں کو گانے کے لیے کہیں جو زر طمع سے خوش نصیبی سے بچی ہوئی ہیں ورنہ ان میں سے چند صاحب فہم بتلا دیتیں کہ انھوں نے کہاں تک بے سر و پا تہمتیں ان پر رکھی ہیں۔ کیونکہ وہ بذات خود ریاکار مردوں سے کہیں زیادہ محبت کرنے والی وفادار اور ہمدرد ہیں ممکن تھا وہ خود شاعری کرتیں اور بتلاتیں کہ مرد ظالم۔ جفاکار۔ ریاکار۔ ہی نہیں بلکہ محبت کے جذبات سے اکثر و بیشتر خالی ہے۔ اور جھوٹا بھی بیحد بولتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس شب باشی کرنے والے اپنی عورتوں کو کسقدر جھوٹ تراش تراش کر اپنی شب کی غیر حاضری کے لئے عذر و معذرات کرتے ہیں۔ اور ہمارے یہاں چھپ چھپ کر آتے ہیں اور اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ ہم سے بھی یہی کہتے ہیں اور اپنی بیویوں سے بھی یہی کہتے ہیں ــــ "ہم محض تم پر عاشق ہیں اور جان سے زیادہ چاہتے ہیں" ــــ لیکن ریاکار اور بودے اتنی جرأت اور ہمت ہرگز نہیں رکھتے کہ اپنی محبت کو سب کے سامنے ظاہر کر دیں بلکہ چھپاتے پھرتے ہیں وہ بھی ایسے کہ جیسے جرائم پیشہ اپنے جرموں کو چھپاتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ کہیں افشاء سے جیلخانہ کی سیر نہ کریں۔ یا معاشرہ کی نگاہ میں ذلیل نہ ہو جائیں۔

کبھی ہم کو یہی مرد کہا کرتے ہیں۔ وہ بھی بڑے فخر کے ساتھ بلکہ مونچھوں پر تاؤ دیکر "کسبی! ذلیل! طوائف! بیحیا! بازاری عورت" ! لیکن ہماری شرافت کا (وہ جو کچھ بھی ہے) بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے آج تک کچھ نہ کہا۔ لیکن کیا میں ان کو "جرائم پیشہ۔ بدمعاش! ذلیل عیاش! اوباش۔ بے شرم دھوکہ باز۔ دغاباز! جھوٹا! کمینہ! بیوفا۔ بے غیرت! زناکار! فاسق فاجر! ریاکار! ناعاقبت اندیش! اپنے بیوی بچوں پر طرح طرح کے ظلم کرنے والا! وغیرہ وغیرہ" نہیں کہہ سکتی؟ — کیا ان خطابات کی صداقت کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت ہے؟ —————— !

اگر میرے یا کسی طوائف کے کوئی عاشق صاحب اس ڈائری کو اتفاً پڑھ پائیں تو دل میں سوچیں کہ وہ کہاں تک شریف ہیں! اور کہاں تک میرے دیے ہوئے خطابات سے بچ سکتے ہیں!

خالی از دلچسپی نہ ہوگا اگر میں یہاں ایسے عاشقوں کی شاعری کے پارینہ تخیلات —— "عاشق!" —— "معشوق"! —— "رقیب"! —— "دربان"۔ تخریب تخئیل۔ اور اتباع شاعری کو بیان کرتے ہوئے ان شعرا سے (بقول شخصے) خطاب کروں اور ذہنیتِ شعریت کو بدلنے کی اپیل کروں:۔

نہ بدلے گی زمانہ کی ہوا کیا؟ ؏ نہ پیدا ہوگی عورت میں وفا کیا؟
پڑے گا کیا سدا درباں سے عاشق؟ ؏ ملیگی خاک میں عزت سدا کیا!
دعائیں ہونگی کیا سب صرف خالی؟ ؏ ودرجاناں کبھی ہوگا نہ وا کیا؟
ہے اسکے ہاتھ میں ایک تیغ براں ؏ نہیں میدان لاشوں سے پٹا کیا؟

بسترِ غیر کو جلوت بنے ہے خلوت عمر ہو زید ہو۔ بکر و رضا گیا؟

اُن کے معشوق کے خاکہ پر بنظرِ استہزا یوں دیکھا جا سکتا ہے:-

سنگھار اُن کا ابھی تو ہو رہا ہے کریں گے وار سب پردہ نہ کیا گیا
اُسے تو چاہئے ہرجائی عورت کوئی ہو ڈومنی کیا بیسوا گیا!

سنا گیا ہے کہ غالب صاحب ایک ڈومنی پر ایسے ہی عاشق تھے جیسے کہ کئی شاعر مجھ پر مرتے ہیں ــــــ

سجدے میں بولتے عاشق سے پوچھو کوئی مردود کی سنتا ہی مر گیا
ابھی نکلا تھا پی کر ایک عاشق پٹا گیا وہ رقیبوں سے پٹا گیا

پرانی شاعری کا ہو تتبع نہیں پروا تخیل ہے بندھا گیا
بھری جس میں ہوں بے جا باتیں ہو ایسی شاعری میں بھر مزا گیا!
غبار آلود ہے مطلع سخن کا تو دل افزا ہو مقطع کی فضا گیا!
بدل دو اب زمانہ بھی ہے بدلا تخیل میں پرانے ہے دھرا گیا
عنایت سب پہ ہے ان کی برابر امیر و داغ گیا ذوق و عطا گیا!

لکھنا کیا چاہتی تھی اور کیا لکھ گئی! بہرکیف یہ بھی میری زندگی کا معنوی رُخ ہے۔ ہمارے وجود سے اگر ہندوستان کو کچھ فائدہ نا نقصان کا فخر ہو سکتا ہے تو محض اتنا کہ ہمارے بالاخانے خراب ذہنیت کے شعرا کے پیدا کرنے کے کارخانے یا تعلیم گاہیں ہیں۔ جیسا ہم سکھاتے ہیں

اس لیے وہ ان گناہ وہ سیکھتے ہیں جو سبق ہم نہیں بھی پڑھاتے وہ زبردستی یا خواہ مخواہ ہی پڑھ لیتے ہیں۔ اور پھر اس کو حاشیہ آرائی سے پر تکلف کر کے تصنع کی جلا کر کے ایسا ایسا منظوم کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔

غرضکہ ہمارے وجود اور مکان کو تغزل کا سرچشمہ اور منبع و مخرج کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا تغزل کے دریا ہیں کہ بہتے ہیں اور سیکڑوں معصوموں کو ساتھ بہا لیجاتے ہیں۔ کاش! شعرا شریف عورتوں کیطرف توجہ کریں اور ان کے حقیقی جذبات کو بھی صحیح معنی میں منظوم کر کے اپنی زبان کی شاعری کی کمی کو پورا کریں!

عزیز صاحب اور میر صاحب معہ دیگر احباب تشریف لائے۔ گانا سنا کیے۔ خاموش بیٹھے۔ غالباً۔ شاعر ہوتی تو ان کے جانے پر مرثیہ پڑھ دیتی۔ کتنی عجیب بات ہے مرد کسی کو چاہے تو واویلا مچائے قیمت دے۔ خریدے۔ ــــــــــــ ورنہ شاعری کرے! ہجر و فراق کے مظاہرے الفاظ کے رنگین لباس میں شوخی کے ساتھ کرتا پھرے۔ محبوب کو، مطلوب، کو چاہے کہہ دے۔ کبھی پروانہ کرے اور اظہار عشق زمین اور آسمان کے قلابے ملا دے۔ لیکن عورت جب کسی کو چاہے تو نہ اظہار کر سکے نہ گلا نہ شکوہ! اور شاعری کرنے کا تو اسے کوئی حق ہی نہیں کیونکہ وہ " بلا شرکت غیرے بخق مرد محفوظ ہے۔ میر صاحب روٹھے ہوئے ہیں۔ عزیز صاحب معمہ ہیں اور بھی ایک دو کیا! کئی ایسے ہیں جن کو میں چاہتی ہوں پسند کرتی ہوں۔ مگر ان سے کیسے کہوں

اور کیا کہوں اور اب میر صاحب کو کیسے مناؤں ! ــ اور عزیز صاحب کو کس طرح بے تکلف بناؤں اور اُن کو کیسے سمجھوں ! ـــــــــــــــــــــــــــــــ

مجھے یقین واثق ہے کہ یہ چند میرے محبوب بھی مجھی کو ظالم بیوفا اور بے نیاز ـ غماز اور خدا جانے کیا کیا سمجھتے ہوں گے اور کیا کیا کہتے پھرتے ہوں گے ! ـ خدا بچائے اس "طلب اور پسند سے" ! ـ مجھے جب تک کسی کو پسند کرنے کی ضرورت اور محبوب بنانے کی طلب نہ تھی ـ میں بہت کچھ قلبی خلش سے بچی ہوتی مگر اب یہ طلب بلائے بے درماں بن گئی ہے ـ میں آرزوؤں کا گلا گھونٹ گھونٹ کر ہی نہیں رہ جاتی بلکہ اپنی زبان کو بند کرنے اپنے گلے کو گھونٹنے پر مجبور ہوں حتیٰ کہ آنکھ سے بھی دل بھر کر نہیں دیکھ سکتی کیا کوئی مرد شاعر میرے ان جذبات کو سمجھ سکتا اور ان کی ترجمانی کر سکتا ہے ؟ ناممکن ہے ـ اس خود غرض کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ عورت کے جذبات پر شاعری کرے ایسے نے شاعری کئی کی ـ مگر سناؤں کسے اور کون داد دے گا ؟ کون سنے گا ؟ ـــ اگر جیجی بھی تو مرد کہدیں گے ـ بد معاش ـ جھوٹی رنڈی ـ پیسہ کے لیے پھانسنا چاہتی ہے " آمد و آورد دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا ـ ارادہ ہے کہ شراب پینا شروع کر دوں ـ مرد کہتے ہیں کہ اُس سے غم غلط ہوتا ہے ـ حالانکہ وہ بر خود غلط ہیں ـــ مگر ہاں ! یہ ممکن ہے کہ شراب کی مدد سے شاعری زور و شور لعیانہ کر سکوں اور آخرکار دھواں دھار شاعری کے طوفان ـ بپا کر دوں ـ آندھیاں چلا دوں بگولے اڑا دوں ـ اور مردوں کو ہوائیں اور

ان کی شاعری کو چٹکیوں میں اڑا دوں ۔ اور جذبات نسوانی کا مظاہرہ کردوں اور ان زور دکھاؤں ۔ نقشہ جما دوں ۔ سکہ بٹھا دوں اور اس بہتر نصف ؎ ۔ کو اُس کی موزوں جگہ پر متمکن کردوں! جہاں سے غاصب مردوں نے اس کو ڈھکیل کر ہٹایا اور گرا دیا ہے!

۲۹/جون ۱۹۳۰ء

میرے مطلوب اور محبوب (بقول مردوں کے میرے عشاق) پچھلے دونوں روٹھے رہے! من گئے! جب جی چاہا پھر بگڑ گئے! ۔ اور جب جی میں آئی تو پھر خوش ہو گئے ۔ ایسے ہی روٹھتے اور منتے رہتے ہیں یہ عشاق! اور ایسے ہی بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں یہ یہ مردوے! جب بالکل بگڑ جاتے ہیں تو میں بھی بگڑ جاتی ہوں ۔ میں ذرا منہ چھپاتی ہوں تو وہ بھی شدہ شدہ روپوش ہو جاتے ہیں ۔ کس کس کا غم ۔ کس کس کا ماتم کروں ۔ دل پر پہلے نقش کرتے ہیں پھر سکہ جماتے ہیں ۔ پھر داغ لگاتے ہیں ۔ تب چرکے دیتے ہیں ونگ لاتے ہیں ۔ گل کھلاتے ہیں ۔ اور بھاگ جاتے ہیں ۔ اور صورت بھی نہیں دکھاتے ۔ کتنے کتنے داغ ہیں میرے دل پر

ان بنگوڑے مردوں کے! کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں۔ کیا کیا شان دکھاتے ہیں! کیسے کیسے سبز باغ دکھاتے ہیں! کیسے کیسے وعدے کرتے ہیں۔ کس کس طرح مہر محبت۔ ثبت۔ کرتے ہیں! اور کیسی کیسی قسمیں کھاتے ہیں! زر لٹاتے ہیں دم بھرتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں "مرتے ہیں"۔ "مرتے ہیں" مگر کبھی بیمار تک نہیں ہوتے۔ اور کہتے یہ ہیں کہ "ہم بیمار غم ہیں" باتیں خیالی باتیں بناتے ہیں۔ اور دائمی نباہ اور بھنسے اپنے کے عہد وپیماں کرتے ہیں۔ لیکن رسّی کٹا کر چاہے جب بھاگ جاتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

غضب تو یہ ہے کہ آج تک کسی ایک مرد نے بھی سچ نہ بولا۔ نہ قبولا۔ اور نہ کہا۔ اور نہ کہا "ہم کو نہ محبت ہے نہ عشق ہم چند دنوں تک تمہارے حسین جسم کے کھلونے سے کھیل کر بھاگ جائیں گے"۔ کیا کسی مرد میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ سچ بول سکے۔ کیا سب عشاق جھوٹے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سچے ہمارے یہاں آتے ہی نہیں۔ اور نہ ہی ان کو آنا چاہئے۔ جھوٹے عشق! محض شاعری کرنے تشریف لاتے ہیں۔ ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں۔ دم کٹا کر۔ پر کٹا لنڈورے بنکر عزلت نشیں۔ بلکہ سجادہ نشیں بنکر بیٹھ رہتے ہیں۔ اور ان کو بھولے سے بھی خیال نہیں آتا کہ کسی عورت کے دل پر ان کے لگائے ہوئے کتنے زخم ہیں جو ناسور بنکر رہ گئے ہیں! یقین ہے کہ مجھ سے پیشتر بھی سیکڑوں عورتوں کو ان عیاش مردوں نے مجھ سے زیادہ ہی ستایا اور جلایا ہوگا۔ جی چاہتا ہے کہ میں اُن کی موجودہ نسلوں سے انتقام لوں۔

ان کا خون چوسوں اور ان کو تبلا دوں کہ تم جھوٹے عشقباز ہو۔ ریاکار ہو ہوس پرست ہو!

مگر میری ہمت نہیں پڑتی! جس کی وجہ یہ ہے کہ میں پیسہ کی محتاج ہوں۔ روزی کی بھوکی ہوں آہ! مرد! کمبخت مرد۔ عورت کو مجبور بناتے ہیں اور جب ان کو مجبوری کا یقین ہو جاتا ہے تو خوب ظلم ڈھاتے ہیں کاش وہ بھی کبھی مجبور ہو جائیں اور عورت اُن سے خون آشام انتقام لے سکے!

مگر سوال میرے سامنے اکثر یہی آتا ہے کہ میں کیوں نہ ہمت پیدا کروں اور کیوں نہ مجبوری کی قید کو توڑ دوں۔ اور کیوں نہ ڈاکہ زنی۔ چوری اور جعلسازی سے دولت کے انبار لگا کر مرد کو مجبور بنا کر اس کو محبوب بنا کر رکھوں اور پھر یہ بھی شرافت نفسی برتوں کہ اس کے ساتھ ظلم کو بھی روا نہ رکھوں۔ بلکہ اُسے چاہوں اور سچے دل سے چاہوں اور ہمیشہ چاہے جاؤں —————— کیا یہ ممکن ہے؟

خدا اس مرد کو سمجھے! اس نے نظام تمدن کو ایسا بنا رکھا ہے کہ عورت اس میں ہاتھ پاؤں ہلا ہی نہیں سکتی کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ کاش تمام دنیا کی عورتیں متفق اور متحد ہو جائیں اور موجودہ نظام معاشرت کو درہم برہم کر دیں اور مرد کو اگر بالکل نیچے نہ گرائیں تو اتنا تو کر دیں کہ ان کو اپنے برابر سے اونچا نہ ہونے دیں۔ اور اگر وہ ابھریں بھی تو

ان کا سر اسی طرح کچل دیں جس طرح کہ آجکل ہم کو محض برابر آنے کیلئے کچھ ابھرنے پر کچل دیا جاتا ہے۔ دبا دیا جاتا ہے۔ چھپا دیا جاتا ہے۔ معتوب کیا جاتا ہے۔ ملعون بنایا جاتا ہے

کسقدر ظالم ہیں یہ مرد! کتنے نامنصف ہیں یہ مردوے! اور کتنا ناروا ہے انکا رویہ! بے دست و پا عورتیں! کمزور عورتیں! وفا شعار عورتیں! محبت کرنے والی عورتیں! سچ بولنے والی اور ایثار کرنے والی عورتیں! جن کو فطرت کی بارگاہ سے بالکل مردوں کی طرح دل و دماغ اور یکساں جذبات ودیعت کیے گئے ہیں ان کے ساتھ مردوں کا یہ سفاکانہ رویہ! اور غلامانہ برتاؤ! وہ اگر مردوں سے بڑھکر نہیں ہیں تو گھٹکر بھی نہیں ہیں۔ اگر طاقت اور شجاعت میں وہ عورتوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ تو محبت ایثار اور وفاداری میں عورتیں ان سے کئی درجہ بڑھی ہوئی ہیں۔ اور ایسے ہی تمام انسانی کردار میں وہ کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ مرد کے ہم پلہ ہیں۔ مساوی ہیں۔ برابر ہیں اور تاریخ اس کی ہمیشہ سے شاہد ہے۔ مگر مرد! ظالم مرد عورت کو جس کے وجود کے بغیر دنیا قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ جو دنیا کی بہترین اور حسین ترین شے ہے۔ کمترین ہی نہیں بلکہ ذلیل ترین اور بالکل بے قدر و کم مایہ سمجھے ہوئے اور بنائے ہوئے ہے!

رو بہار بہنے دو۔ گھٹنے دو۔ ان مردوں کو ایں اب نہ مناؤں گی نیچے نہ گردنگی۔ جتنا مجھے نیچے گرایا گیا ہے میں اتنا ہی ان کو گراؤں گی۔

عورت کی فطرت کی قدر کراؤنگی اور اُس کے جذباتِ انسانی کو ان کے سامنے رکھدوں گی اور غیرت پر غیرت دلاؤنگی ——— !

ممکن ہے اپنے اٹھے ہوئے کاموں کو دیکھکر وہ بھی مجبور ہو جائیں۔ اور ہمارے سامنے گر پڑیں ٹھوکریں کھائیں اور پھر ہمارے اٹھائے اٹھیں اور پھر ہماری مجبوریوں کا اندازہ کریں ہم پر رحم کھائیں — اور شائد اس طرح ہم اور وہ دونوں برابر ہو جائیں۔ برابر رہ سکیں اور رہ جائیں۔ اور اسی طرح دنیا میں۔ رحم و محبت۔ ہمدردی و خلوص یکساں ہوکر صنفی برتری کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے! اور دنیا میں انصاف۔ چین اور سکوں کا دور دورہ ہو جائے۔ اور عورت اور مرد ایک دوسرے کے دوش بدوش چلکر حقیقی شرکتِ حیات کے فرائض کو مخلصانہ انجام دینے لگیں!

کہاں چلی گئی اور کیا لکھنے لگی۔ عباسی خالہ کے پیام و سلام آتے رہے ان کی خوش باشی کی خبریں آتی رہیں۔ اور میری والدہ کو اُن کی یاد ستاتی رہی۔ مگر میں نے ہمیشہ یہی دعا مانگی کہ وہ اب کبھی واپس نہ آسکیں۔ اور وہیں عزت سے رہ جائیں!

۷/ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

سہ پہر ہی سے مجلس خاص کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اور

گزک و کباب اور شراب منگائی جانے لگی ۔ آج مجھے ساقی گری کرنی تھی ۔ اور گھنٹوں کو چلو میں الو بنانا تھا ۔ اس جلسہ کے لیے مکان بھی میرا ہی منتخب ہوا تھا ۔ مجھکو ناچ گانے اور ساقی گری کیلیے کافی رقم پیشگی دیدی گئی تھی ۔ اور میں نے بھی سہ پہر سے آراستگی شروع کر دی تھی ۔ جلسہ میں شریک ہونے والے چوٹی کے عیاش لوگ تھے ۔ اُن کے سرغنہ کا نام لطیف تھا جو تمام شہر میں اپنی عیاشی اور بد معاشی کے لیے مشہور تھا ۔ باقی لوگ کچھ اس کے مہمان تھے اور کچھ اُس کے دوست تھے ۔ شام ہوتے ہی کچھ لوگ آن موجود ہوئے اور دو شخصوں کی آمد کا بےچینی کے ساتھ انتظار کرنے لگے ۔ ان میں سے ایک ـــ جیساکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ۔ ان کا دوست تھا اور دوسرا ایک دولتمند رئیس زادہ تھا ۔ دس بجے ایک موٹر آگئی جس میں سے یہ دونوں شخص بھی وارد ہو گئے ۔ اب کیا تھا جام پر جام چلنے لگا ۔ لیلیٰ ناچ رہی تھی اور پلا رہی تھی ۔ اور مجھے بھی بغیر پیے کافی نشہ ہو گیا تھا ۔ میرا خیال ہے کہ عالم نشہ کو عالم خیال سے گہرا تعلق ہے اور خیالات کی پرواز ماحول اور فضا کے سرور اور کیفیات سے ملکر انسان کو ایک قسم کا نشہ ہو سکتا ہے ۔ جو بہت ہی لطیف اور نازک ہوتا ہے ۔ بہرکیف اس محفل رقص و سرود کی فضا اسقدر گرم ہوئی کہ اب اس میں مستی اور بیہوشی کے تاثرات پیدا ہو گئے جس نے مجھے بھی بدحواس بنا دیا ۔ اور میرا نشہ ہرن ہو گیا ۔ نتیجہ کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ مجھ کو اس رئیس زادے کی گود میں لڑھکا دیا گیا ۔ جس نے مجھے ایک کھلونا

سمجھکر زیادہ قابل التفات نہ سمجھا۔ یا نہ سمجھ سکا میں تڑپ کر نکلی۔ مگر پھر دبوچ لیگئی ——— جس شخص نے اب مجھ کو اپنی گرفت میں لیا تھا وہ کالا بھجنگ۔ دیو صفت نامعقول انسان تھا۔ جس کے جسم لباس اور منہ سے بدبو اور قے اور عفونت آرہی تھی میں نے لاکھ چھوٹنے کی کوشش کی۔ اور طرح طرح کی ڈانٹ بتائی۔ شور مچایا۔ مگر سب بیکار ثابت ہوا۔ میری چیخ اور فریاد پر قہقہہ پڑنے لگا۔ میری آہ وزاری کو باعث تفریح سمجھا گیا۔ اور میری ڈانٹ ڈپٹ کو بھی مذاق میں اڑا دیا گیا ——— میرا اس دنیا میں سوائے ماں کے اور کون تھا۔ میں نے اس کو آواز پر آواز دی۔ لیکن اس کو پکڑ کر کمرے سے باہر نکالدیا گیا اور نوکروں کو مارپیٹ کر بھگا دیا گیا۔ کمرے کے دروازے بند کر لیے گئے۔ اور میں مجبور محض اور مایوس ہو کر رہ گئی۔ اب مجھ کو اٹھا کر دوسرے کی گود میں پھینک دیا گیا۔ اور اس طرح مجھ کو بجائے ساقی کے ساغر بنا لیا گیا ——— میں نے آخرش رونا دھونا اور تلملانا شروع کیا۔ لیکن وہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اور کسی کو مجھ پر رحم نہ آیا ——— میں نے بدرجہ مجبوری مقابلہ اور عاجزی کے سبب ہتھیار ڈالدئے۔ اور ان کی انگلیوں پر ناچنے لگی جس سے وہ سب بیحد خوش ہوئے۔ اور انھوں نے پھر ایکبار مجھے ساقی بنالیا۔ میں نے اب دانستہ بوتلیں انڈیلنا شروع کردیں اور ہر ایک کو معہ عشوہ و ناز و غمزہ دستی پلانی شروع کردی جس کا نتیجہ میری مرضی کے مطابق ظہور پذیر ہونے لگا۔ اور کچھ لوگ جھوم جھوم کر گرنے لگے

اور چند کو اپنے دست و پا پر کوئی قابو نہ رہا۔ لیکن تین آدمی اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے کمبخت بلا نوش تھے۔ اور شراب بھی ختم ہو گئی تھی

اور اب پھر مجھے بجائے ساقی کے ساغر بنانے کی ابتدا ہو گئی جس سے میں کانپ اٹھی۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو درد سے خالی ہو۔ میں ہیجان ہو گئی! ——— میں بیہوش ہو گئی!

———

کتنی ہی دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے خود کو ایسی حالت میں پایا۔ کہ خود پر نفرین کرنے لگی۔ اور خیال کرنے لگی۔ کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتی! اگر ہوتی اس کوچہ میں کبھی نہ آتی! اگر آتی تو بھاگ جاتی۔ اور کاش محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی۔ اور ذلیلوں ظالموں اور عیاشوں کے عیش و ہوس کا تختۂ مشق بننے والی۔ "ملکۂ حسن" نہ بنتی ——— پتھر کے کلیجہ کی عینک سے عورتوں کے تماشہ کرنے والے مرد! اور آزادی اور حسن و دولت پر ناز کرنے والی طوائفیں آئیں۔ اور میری اس حیات کے بھیانک۔ سنسنی خیز اور دلوں کو ہلا دینے والے حالات سے عبرت حاصل کریں۔

میری شان ——— میرا حسن ——— میری دولت ——— میری حکومت محض "میرے ایک مرد" کے نہ ہونے سے سب ہیچ ہی ثابت نہ ہوئیں بلکہ وبال جان اور زہر ہلاہل ——— بن گئیں!

———

اب میں انتقام کی آگ میں جلنے لگی۔ جانتی تھی کہ غصہ اور زور زبردستی کا بدلہ ہوگا۔ میں مکر و فریب پر اتر آئی۔ اور میں نے انتہائی ہوشیاری کیساتھ ان میں سے ایک کے کان میں کہا۔ میں آپ کو عرصہ سے چاہتی ہوں اور اپنی ساری عمر آپ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ اتنا کہکر میں نے محبت کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کو یقین دلانے کے لئے وہ تمام حرکتیں بھی کیں۔ جو ضروری تھیں اب اس نے عالم نشہ ہی میں ایک کروٹ لی اور متکبرانہ انداز میں کہا۔ "دیکھو بھائی مذاق ہو چکا۔ لیلیٰ میری ہے اور بالکل میری اسکو اب کوئی صاحب ہاتھ نہ لگائیں" ـــــ اس جملہ پر چند نے قہقہہ لگایا اور چند چونکے لیکن ان کے سرغنہ لطیف کو تاؤ آگیا۔ اور اس نے گرج کر کہا "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ لیلیٰ پر میری طبیعت ہے۔ اس کو کوئی آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایک تیسرے شرابی نے بھی اکڑ کر اسی قسم کے جملے دہرائے۔ اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ ہوتے ہوتے ہاتھا پائی۔ لپاڈگی پر نوبت پہنچ گئی۔ اب کیا تھا۔ ہر شخص جوش میں آگیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چند اس طرف ہو گئے اور چند اس طرف ہو گئے گھونسے بازی کے ساتھ ہی کشتی بھی شروع ہو گئی۔ اور لکڑیاں اور چھڑیاں برسنے لگیں جس میں سے چند مجھ پر بھی پڑیں اور میں بلبلا گئی ـــــ مگر پھر بھی میرے جذبۂ انتقام کی تسکین اور میری لگائی ہوئی آگ نے مجھ کو بد حواس نہ ہونے دیا۔ حتی کہ میں موقعہ پا کر دروازہ کھولکر باہر بھاگ آئی اور میں نے

ہمت کرکے باہر سے دروازہ بند کر دیا ——— کئی کے سر پھوٹ گئے کئی زخمی ہوئے۔ کئی گر گئے۔ ان میں سے کوئی بیہوش ہو گیا تو کوئی ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ اور کوئی نشہ اور مارپیٹ سے بیدم ہو کر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ یہ لوگ کچھ ہوش میں آ آ کر بھی لڑتے رہے اور گر گرتے رہے اور ہیں اور تمام گھر کے آدمی ہانپتے کانپتے ادھر اُدھر پھرتے رہے۔ مجبوراً میں نے پولیس کو اطلاع دی جس نے آ کر دروازہ کھولا اور سب کو حراست میں لے لیا۔ اب ہماری سب کی جان میں جان آئی ———

اُن کے جانے کے بعد میں اپنی والدہ کو طوائف بننے پر لعن طعن کرتی رہی۔ جو ایک کلمہ بھی زبان سے خلاف نہ نکال سکی۔ ——— اور یہ کہتی رہی ”ہاں بیٹی! میں طوائف بنی غلطی کی اور تجھکو طوائف بنایا۔ اور یہی غلطی کی اپنے ساتھ تجھکو بھی لے ڈوبی“۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی ——— تیرے سنگیتر سے تیرے ساتھ رہا تھا شادی کر دیتی یا کسی شریف آدمی سے تیرا نکاح کر دیتی تو ایسے بھیانک واقعات کبھی پیش نہ آتے کاش! میں غریبانہ اور شریفانہ زندگی گزارنے پر تیار ہو جاتی اور اس ذلیل امیرانہ زندگی کا کبھی خواب نہ دیکھتی“! ——— میری والدہ کے اس قسم کے جملوں نے مجھے ایک قسم کا اطمینان اور خوشی بخشدی ——— اور میں ان سب سے الگ ہو کر میر صاحب اور عزیز صاحب کے تصورات سے نیا لی توقعات وابستہ کرنے اور سگون واٹن کے خواب دیکھنے لگی۔

یہاں یہ لکھ دینا کچھ بے محل نہ ہوگا کہ پولیس کو خاموش رکھنے اور بد معاشوں سے بچنے کے لیے۔ ہماری ساری عمر کی کمائی صرف ہوگئی۔

۳۱/ جولائی ۱۹۳۰ء

۳۱/ جولائی سے پیشتر کے دن زندگی کے بدترین ایام تھے۔ جن میں حیثیت عرفی ہی نہیں گری بلکہ پیسہ کی کمی۔ دشمنوں کی ریشہ دوانی علالت اور طرح طرح کی پریشانیوں کے سامنا کرنے میں دن گزری۔ گھر کے سب آدمی رسوا اوقات رو رو دئے۔ ادھر تماش بینوں کی آمد بھی پولیس کی تفتیش اور مقدمہ کے طویل اور اہم ہو جانیکی وجہ سے کم ہوگئی۔ نتیجتاً آمدنی بھی کم ہوگئی۔ اور اخراجات بہت زیادہ ہوگئے۔ اگر میر صاحب اور عزیز صاحب پوشیدہ طور پر اور عین موقعوں پر مالی امداد نہ کرتے تو یقیناً فاقوں تک کی نوبت آجاتی کیونکہ دلہا کی تکلیف۔ تاہم۔ لاحق ہوئی۔ اور تکلیفات تو قطعاً ختم کر دینے پڑے جس سے والدہ بے انتہا پریشان ہوگئی اور کئی دفعہ ان کو خون کے آنسو رونا پڑے۔ ادھر خالہ کے جانے سے بھی آمدنی میں کمی واقع ہوئی تھی ______ اور تو اور میر صاحب اور

عزیز صاحب بھی ہمارے گھر آنے سے پرہیز اور احتراز کرنے لگے۔ اور اس دوران میں بہت ہی کم آئے ________

۳۱ر جولائی کی شب میں عزیز صاحب اپنی تمام سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ آئے۔ اور بجائے اس کے کہ مجھ سے گلنے کی فرمائش کرتے۔ اٹھکر میری والدہ کے پاس جا بیٹھے اور بہت دیر کی خاموشی کے بعد مجھ سے تخلیہ میں گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی ________ میرے کمرے میں پہنچکر پہلے تو چپ رہے پھر زبان کھولی "لیلا! میں تمھاری اور تمھاری والدہ کی ابتدائی اور موجودہ زندگی سے بخوبی واقف ہوں" میں تعجب کے ساتھ سننے لگی مگر خاموش رہی اب انھوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ تمھاری والدہ نے زبردست غلطی کی کہ .... "میں نے ان کے جملہ کو۔ مجھ کو طوائف بنایا" ____ کہکر ختم کیا۔ انھوں نے کہا "اور تم گڑھے میں باوجود عقل اور آنکھیں رکھنے کے گر پڑیں۔ یہ تم نے خاموش غلطی کی ____ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پھر کہا۔ اور اب اس گڑھے سے نکلنا نہیں چاہ رہی ہو۔ یہ غلطی ایسی ہے جو تم کو بھیانک انجام پر پہنچکر رہے گی"! میں ان جملوں کو سنکر سن ہوگئی اُن کے جملوں میں حقیقت تھی اور دل کو ہلا دینے والی صداقت تھی۔ مگر ان کا برتاؤ ہمیشہ سے میرے ساتھ ایسا عجیب اور انوکھا تھا کہ میں مشکل ہی سے کبھی کوئی صحیح رائے ان کے متعلق

قائم کر سکی تھی آج اُن کا لب و لہجہ اسقدر درشت اور طنزیہ تھا کہ جس کے سننے کی میں عادی نہ تھی لیکن باوجود ان تمام باتوں کے میں نے ان میں ہمدردی محسوس کی اور میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "عزیز صاحب! ہمدردی کا شکریہ! مگر آپ کو یہ معلوم ہے کہ غلطی کے ارتکاب کے بعد عورت اس کے اخفا پر اس لیے جان دیتی ہے کہ وہ انفعال اور دنیا کے طعن و تشنیع کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی"۔ عزیز صاحب نے بغیر اپنے جسم کو کوئی حرکت دئے اور بغیر سر اٹھائے کہا۔ "مگر اس کو کیا کہو گی کہ انفعال یا لعنت سے تم بچنا چاہو مگر جو جادہ گریز اختیار کیے ہوئے ہو وہ بذاتِ خود سراپا انفعال بلکہ بحد متبدل ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ تم کو تمہارے سامنے الفاظ میں لعن طعن اور ملامت کرنے والے کم ہیں۔ یا نہیں ہیں۔ یا۔ پاس ہی نہیں آتے! میں نے تفہیم میں آسانی کے لیے کہا"۔ خدارا ذرا صاف صاف کہیے! اب انھوں نے کہنا شروع کیا۔ کوئی شریف عورت فاحش غلطی یا شرمناک فعل کا اقدام کرتی ہے۔ اور لوگوں کے لعن طعن اور بزرگوں یا قانون کی تہدید اور سرزنش سے بچنے کے لیے تن آسانی کے باعث تعیش کے جذبات کے تحت طوائف بنجاتی ہے۔ وہ اس کو اپنی مجبوری کے نام سے تعبیر کرتی ہے"۔ میں نے کہا۔ "تو کیا آپ کے نزدیک یہ مجبوری نہیں؟"۔ انھوں نے جواب دیا۔ "نہیں بالکل نہیں۔ یہ تو بالکل ایک ایسی بات ہوئی کہ ایک ہٹا کٹا انسان کشاکشِ روزگار سے تنگ آکر دریوزہ گری شروع کر دے اور کسی کے سمجھانے پر اس کو

اپنی مجبوری بتلاکر اپنے فعل کا جواز حاصل کرنا چاہے" میں نے ایک غمگین لہجہ میں کہا۔ "اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا کرے؟" انھوں نے کہا۔" ذریعہ معاش کے لیے آسائش حصول کو مدنظر نہ رکھے بلکہ ہر قسم کی محنت اور مزدوری کے لیے تیار ہو جائے اور ایسا کرکے رہے ورنہ فاقوں سے جان دیدے" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں شرافت کا مقتضا تو یہی معلوم ہوتا ہے"۔ انھوں نے ذرا دیر کہا۔ "طرفہ تو یہ ہے کہ اپنے کسی سابقہ فعل یا غلطی کے انفعال کے دبانے اور چھپانے کے لیے وہ طوائف بنے لیکن یہ کبھی نہ سوچے کہ جس دریائے انفعال میں غرق ہونے سے وہ بچنا چاہتی ہے وہ طوائفانہ زندگی میں انفعال و ندامت کا اتھاہ سمندر بن کر گھیر لیتا ہے اور طوفان برپا کرکے سفینۂ حیات کو گناہوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر کسمپرسی۔ بیچارگی اور مخالف ہواؤں میں بہاکر ضعیفی کے خارزار کنارے اور جھاڑ جھنکاڑ کو دوامی طور پر اٹکا دیتا ہے اور اپنی بے پناہ موجوں کے تھپیڑے لگاتا ہے کہ پاش پاش کرکے چھوڑتا ہے ——

لیلیٰ! یہی انجام تمھاری زندگی کی کشتی کا ہونے والا ہے ....

........" میں اس حقیقتِ عمل اور یاداش عمل اور انجام حیات کے خاکہ کو سنکر اور سمجھ کر لرزہ براندام ہو گئی اور ایک گہرے فکر میں غرق ہو گئی —— میں خاموشی کے ساتھ سوچ ہی رہی تھی کہ عزیز صاحب آہستگی کے ساتھ اٹھے اور کمرے سے

باہر چلے گئے اور میں سوچتی رہ گئی۔

میں نے اس سے پیشتر بھی کئی بار عزیز صاحب کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر کبھی کامیاب نہ ہوئی۔

میں کمرے سے نکلی۔ خیال تھا کہ وہ باہر یا کسی دوسرے کمرے میں موجود ہوں گے۔ مگر وہ جا چکے تھے

میں تمام شب عزیز صاحب کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ مگر یہ ہرگز نہ سمجھ سکی کہ ان کی پند و نصائح کی علت غائی کیا ہو سکتی ہے۔

عجیب ہیں عزیز صاحب! اور انوکھی ہیں ان کی باتیں اور مخبر العقول ہے ان کا کردار! لیکن اسکو میں نہیں چھپا سکتی کہ بیحد اچھے ہیں وہ! اور نہایت ہی معقول ہوتی ہیں ان کی باتیں! البتہ ان میں دلکشی اور دلآویزی نہیں ہوتی۔ بلکہ خشکی اور طنز بھرا ہوتا ہے۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ عزیز صاحب مجھے کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ کبھی انھوں نے اظہار محبت نہ کیا۔ کبھی انھوں نے مجھے اظہار محبت کا موقع نہ دیا کبھی دل کی بات نہ کہی! کبھی دل کی بات نہ سنی۔ غضب تو یہ ہے کہ ان کے زاہد خشک ہونے پر بھی میرا دل ہمیشہ اُن کو پسند اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا رہا!

۵/ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء

ساڑھے چار ماہ کا عرصہ جیسے ہی ختم ہوا۔ عباسی خالہ کے نکاح کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ اور وہ ہنسی خوشی اپنے گھر آگئیں۔ خوب موٹی تازی ہوکر لوٹیں۔ زیور اور نقد روپیہ توقع سے بھی زیادہ ساتھ لائیں۔ اور اپنی شادی شدہ زندگی تمسخر انگیز واقعات اپنی چالاکی اور الو بنانے کے طریقے اور ہتھکنڈے سنانے لگیں اور مجھ کو درس تقلید دینے لگیں۔

میں حادثات گذشتہ سے متاثر ہوکر شادی کیلئے تیار ہی نہیں بلکہ کوشاں ہوگئی تھی۔ لیکن خالہ صاحبہ کی تلقین اور ساتھ لائی ہوئی دولت کے کرشموں نے پھر آزادی کا سبق پڑھانا شروع کردیا اور میں انجامِ حیات کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

گیارہ بجے شب کو میر صاحب تنہا تشریف لائے اور کچھ دیر گانا سننے کے بعد تخلیہ کے خواہاں ہوئے۔ آج وہ پھر اپنے دلکش رنگ میں تھے۔ اور میرے خرمن ہستی پر بجلیاں گرا رہے تھے۔ اُن کی روح پرور نظر اور اُن کے کیف بار تکلم نے میرا ہوش چھین لیا۔ اور میں عالم سرشاری میں کچھ کا کچھ ہوگئی اور کچھ کا کچھ بکنے لگی۔

شب خوابی کے کمرے میں آتے ہی اُنھوں نے گل کھلانے شروع

کیے ۔ اور اتنے کھلے کہ حجاب کے پردوں کو سرمستانہ کھو ڈالا ۔ میرا غنچۂ دل چٹک کر شگفتہ ہو گیا ۔ اور دماغ کے پردے بھی وا ہو گئے۔ اور میں کسی دوسری دنیا کی سیر کرنے لگی ۔ اور وہاں پہنچ گئی ۔ جہاں پہنچنے کی مجھے اجازت نہ تھی ۔ مگر آرزو تھی

میں نے اسی عالم سرشاری میں کہا ۔۔ "خدارا مجھے اس ذلیل زندگی سے جلد نکال لو" ۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور کہا ۔۔ "کیا خالہ کا سبق تم بھی دہرانا چاہتی ہو" ۔۔ میں نے حسرت کے ساتھ "میر صاحب!" کہا اور ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئی ۔ انھوں نے خود ہی فرمایا ۔۔۔ لیلیٰ! تمھاری خالہ کے واقعہ کو معلوم کر کے مجھے اب کسی طوائف کی وفاداری کا یقین نہیں رہا اس سے پہلے محض سنا کرتا تھا ۔ مگر اب آنکھوں کے سامنے پیش آئے ہوئے واقعہ سے میں اتنا متاثر ہوا ہوں کہ .... میں نے چونک کر کہا ۔۔ "کہ ......؟" انھوں نے فرمایا .... ۔۔ "کہ میں اب وفا کی امید کو ہی منقطع کر دوں اور جب تک بازار حسن سے سامانِ لذت خرید سکوں خریدتا رہوں"۔ مجھ پر مایوسی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور میں نے بہزار وقت کہا ۔۔ "تو کیا اب مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے" ؟ وہ بعجلت بولے "میں شادی کرنا ضرور چاہتا ہوں ۔ مگر نہ کروں گا اور ایک طوائف کے جال میں پھنس کر بیوقوف نہ بنوں گا" ۔ میری تمام توقعات اور حسرتیں مفقود ہونے لگیں اور مجھ کو میر صاحب ایک بدلے ہوئے

انسان نظر آنے لگے ۔ میں طبعاً سست ہوگئی۔ انھوں نے اپنی خوشی اور دست درازی کے رنگ کو قائم رکھنے کی کوشش کی مگر نہ رکھ سکے اب ہم دونوں سست ہو گئے اور کافی دیر تک خاموش رہے۔ میں نے مایوسی کے لہجہ میں کہا "کیا آپ کے دل سے میری محبت جاتی رہی؟ ۔ فرمایا "نہیں اور کبھی نہیں جا سکتی" میں نے کہا "تو کیا محبت کا اقتضا شادی نہیں ہے؟" فرمایا "ہے۔ لیکن یہ دانستہ غلطی ہے" میں نے کہا۔ اب آپ کیا کریں گے؟ فرمایا ۔ بیجائی پر صبر کروں گا اور آپ سے یونہی ہمیشہ ملتا رہوں گا" میں نے کہا۔ اگر میں نے کسی دوسرے شخص سے شادی کر لی تو آپکو کوئی رنج نہ ہوگا"؟ فرمایا "نہ ہوگا" میں نے پوچھا "کیوں"؟ فرمایا "اس لیے کہ آپ روزانہ شادی کرتی ہیں" میں نے تشریحاً کہا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نکاح کر کے کسی کے گھر میں چلی گئی تو کیا اس وقت بھی آپ کو کوئی رنج نہ ہوگا؟" فرمایا "نہیں" میں نے پھر پوچھا "کیوں"؟ فرمایا۔ "اس لیے کہ چند ماہ کے بعد آپ موٹی تازی ہو کر واپس آ جائیں گی اور مجھ سے ملنے میں آپکو کوئی پس وپیش نہ ہوگا"۔ اب میں اس سے آگے کیا کہہ سکتی تھی ۔ مجھ پر مایوسی کی گھٹائیں طاری ہوئیں اور آنسوؤں کا طوفان امڈا ۔ اور میری اشکبار آنکھوں سے خونِ جگر بہنے لگا ۔ جس پر انھوں نے انتہائی ستم ظریفی کے ساتھ فرمایا "میں نے سنا ہے کہ طوائف کو آنسوؤں پر بڑی قدرت حاصل ہے" اس جملہ میں ایسا زہر بھرا ہوا تھا ۔ کہ گلا گھٹ گیا اور کلیجہ

اُبل پڑا اور میں گلو گیر آواز میں رونے لگی۔ پیر صاحب نے سونے پر سہاگہ پر گیا کہ فرمانے لگے "اچھا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں چلا جاؤں۔" اس جملے پر میری ہچکیاں بند ہو گئیں اور میں نے عالم مایوسی کی انتہائی کرب ناک کیفیات کے ساتھ اپنے سر کو ان کے زانو کے سپرد کر دیا اور ہاتھوں سے ان کو پکڑ لیا اور کہا ــــ "خدا را رحم فرمائیے اور جانے کا ارادہ نہ کیجئے!" انھوں نے بیساختگی کے ساتھ فرمایا "اچھا تو آپ خاموش ہو جائیے اور بالکل نہ روئیے"۔ میں نے عمر میں پہلی بار اپنے رونے پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی اور سوائے ہچکیوں پر بس نہ چلنے کے کامیاب ہو گئی۔ سر ضرور میں نے اوپر اٹھا لیا۔ مگر ان کو پکڑے بیٹھی رہی۔ خدا جانے مجھے کیوں خوف لگا ہوا تھا کہ وہ بھاگ جائیں گے اور میری دنیا بدل جائے گی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھ ڈالیں۔ میری نگاہ میں حسرت تھی! تمنا تھی! التجا تھی! لیکن چند سکنڈ کے بعد دل ناصبور نے جگر کاوی کی اور سرچشمۂ خون کے اُبلنے سے ابخرات کی دنیا میں تلاطم پیدا ہوا اور آنکھوں کی راہ سے خون جگر پھر بہنے لگا ــــــــ مایوسی کے آنسو! محبت کے آنسو! بے بسی کے آنسو تھے جن میں صداقت تھی سچائی تھی۔ لیکن خدا جانے کیوں پیر صاحب سوائے اس کے کہ انھوں نے میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے رومال سے پونچھ دیا نہ پسیجے اور کچھ بھی متاثر نہ ہوئے۔ بلکہ فرمایا۔ "لیلیٰ! تم نہیں جانتی ہو۔ روتی ہو مجھے چھوڑ دو۔ میں جاتا ہوں"۔ مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوتی۔ اپنی گرفت بھی

قائم نہ رکھ سکی ۔ اپنے بھاری سر کو بھی نہ سنبھال سکی اور چارپائی پر گر پڑی ۔ میر صاحب اٹھے اور چارپائی سے علیحدہ کھڑے ہو گئے ۔ میں نے فوراً غور کو سنبھالا ۔ اور گردن اٹھائی ۔ دیکھا کہ وہ میری طرف پیٹھ کئے کھڑے ہیں ۔ اس سے مجھے تقویت ہوئی اور میں چارپائی سے نیچے اتر کر ان کے پاس پہنچی ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان کے جسم کو چھوا ۔ وہ بے حس و حرکت کھڑے تھے ۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے سامنے پہنچی ۔۔۔

میں نے جونہی ان کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہتے ہوئے دیکھے اور گھبرا گئی ۔ لیکن میرا سیل اشک اب رک نہ سکا اور اپنی پوری طوفانی رفتار کے ساتھ رواں ہو گیا ۔ میں نے جیسے ہی ان کی طرف ہاتھ بڑھائے انھوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور خفیف آواز کے ساتھ مصروف گریہ ہو گئے ۔۔۔

کافی دیر تک وہ اور میں دونوں روتے رہے ۔ لیکن میں نے جلد ہی اب قلب میں کچھ سکون محسوس کیا اور میرے آنسو بھی بند ہو گئے ۔ اب میں نے کئی بار ان کو رونے سے منع کیا ۔ گلے لگایا ۔ پیار کیا ۔ مگر ان کی حالت میری حالت سے بھی بدتر ہو گئی اور جتنا میں منع کرتی تھی اتنا ہی زیادہ ان کی آنکھوں سے آنسو ابلتے تھے

چند لمحات کے بعد میرے جذبات پھر مجتمع ہوئے ۔ سمٹے ۔ سکڑے اور پھوٹ پڑے اور پھر آنسوؤں کا دریا بہنے لگا ۔ ہم دونوں کے دریائے اشک متصل ہو کر سمندر بن گئے اور ہم نے آغوش کی تنگی

ہیں بیٹھ کر اس میں بہنا شروع کر دیا۔ خیال آفرینی کی پتوار سنبھالی اور امیدوں کے قریب ترین بندرگاہ کی سمت انتہائی سرعت کے ساتھ بہنے لگے ــــــ آخرش سکون کے کنارے پر پہنچے۔ آغوش کی کشتی سے خشکی پر اُترے۔ کچھ دور اسپ خیال پر سوار ہو کر چلے اور پھر محبت کی ٹرین میں اپنی جگہ بیٹھ گئے اور آنکھوں کی کھڑکیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ دیر تک سیر ہو کر دیکھتے رہے ــــــ

فضا بدلی۔ سماں بدلا۔ اور غم کی گھنگھور گھٹائیں برس برس کر جانے لگیں ابر باراں سے دل کا گرد وغبار ڈھل گیا۔ اور کلیجہ کی ٹھنڈی ہواؤں سے غم کے بادل اڑ گئے اور مطلع صاف شفاف ہو گیا کچھ دیر بعد ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی جس میں محبت آمیز خجالت شامل تھی جس سے ہماری آنکھیں جھپک جاتی تھیں اور چہرے اپنا رخ بدلتے تھے حتیٰ کہ ہم دونوں کے جذبات نے پلٹا کھایا ــــــ اور محبت کے جوش وخروش میں ہم ایک دوسرے پر بدل گئے ــــ اور میں جتنی بھی سزا اپنے محبت کے مجرم کو دے سکتی تھی دیتی رہی۔ سزا سہنے والے نے اُف کرنا کیا یعنی خندہ پیشانی سے سزا برداشت کی ــــــ آخرش میں تھک گئی ـــ اور کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ میر صاحب بھی کچھ سوچنے لگے۔ اور کسی خیال کے دل پر ضرب لگانے سے وہ چونک اٹھے ـ آگے بڑھے اور فرمانے لگے "لیلیٰ! مجھے معاف کر دو میں غلطی پر تھا اور آج میں نے تم کو بہت ستایا ہے۔ خدارا اپنے

شیدائی کو معاف کر دو گے" - یہ کہکر وہ عورتوں کی طرح میرے آغوش میں گر گئے - میں نے اپنے ہاتھ اُن کی کمر پر رکھے اور سر کو جھکا لیا - اور کہا "معافی کی کیا بات ہے - میں تو آپ کو اپنا سرتاج سمجھتی ہوں" - وہ ذرا دیر بعد علیحدہ ہوئے چند لمحات کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا - کھلکھلا کر ہنسے اور ایکدوسرے کو مضبوط آغوش میں لیکر مسہری پر گر پڑے - اور صبح تک نہ اُٹھے -

۲۳/ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء

عزیز صاحب نے پچھلی ملاقات کے بعد سے مکان پر آنا قریب قریب بالکل بند کر دیا - لیکن ایک چیز جس کے انکشاف سے میں بیحد خوش ہوئی - وہ اُن کی چھپی ہوئی دبی ہوئی محبت تھی جس کو انھوں نے زبان کے بجائے نوک قلم سے ظاہر کیا اُن کی محبت بہت عزت اور خلوص سے پُر تھی کو بظاہر پھیکی تھی - لیکن میرے قلب پر اس کا گہرا اثر تھا - جس نے نوازن دماغ ہی خراب نہ کیا بلکہ قوت فیصلہ کی بنیاد کو بھی متزلزل کر دیا میں میر صاحب کو چاہتی تھی اور اُن سے شادی کرنا چاہتی تھی اور وعدہ بھی کر چکی تھی - لیکن عزیز صاحب کو بھی بیحد پسند کرتی تھی - اور اُن کی محبت کے انوکھے طرز کو سوجان سے

پیار کرتی تھی۔ اُن کی خاموش فطرت سنجیدہ عادت محمود خصلت اور ہمہ گیر شخصیت نے مجھ پر عرصہ سے جادو کر رکھا تھا میں ان کے لیے ان کی ابتدائے آمد و رفت ہی خیال محبت کی پرورش کر رہی تھی ان کی یہ پوشیدہ محبت چنگاری کی طرح ہمیشہ میرے دل و دماغ میں سلگتی رہی۔ مگر تحریر سے پہلے کبھی اس خاموش ہستی نے شعلہ فشانی نہ ہونے دی بلکہ اپنی سرد مہری سے حتی الوسع بجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ سلگتی اور ٹمٹماتی رہی ——— گذشتہ ڈھائی تین ماہ کے عرصے میں اُن کے پچاسوں خطوط آتے رہے جن کے جوابات بھی میں بطیب خاطر لکھتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائری کا اندراج بھی نہ کر سکی یہ خط و کتابت میری اور ان اخلاقی رفعت کی محبت آمیز جنگ تھی۔ ہم دونوں میں تیر و تبر کے بجائے شمشیر قلم سے موشگافی ہوتی رہی۔ میں نے اُن کو مجنوں کے نام سے ملقب کیا ——— جس کو انھوں نے تسلیم کر لیا وجہ تسمیہ ان فرزانگی آمیز دیوانگی یا در پردہ محبت تھی۔

وہ مجھ کو آزادی کی چار دیواری سے کھینچنا اور قید کرنا چاہتے ہیں وہ کانپتے ہوئے مگر محبت بھرے ہاتھوں سے بیڑیاں بڑھاتے ہیں اور پہنانا چاہتے ہیں۔ مگر میں ان کو لوہے کی بھدی۔ مضبوط اور وزنی زنجیریں سمجھ کر ڈر جاتی ہوں اور اپنے عز و ناز سے جھٹکے دیتی ہوں پہننے سے پہلے ہی توڑنا چاہتی ہوں۔ اور ساتھ ہی اس کے پہنانے والے کی ہمت کو بھی توڑنا چاہتی ہوں۔ لیکن نہ ان کو توڑ سکتی ہوں نہ اسکو!۔

اور غضب یہ ہے کہ کبھی کبھی پہننے کے ارادے سے کنگناپاتی بھی ہوں۔
لیکن یہ بھی چاہتی ہوں کہ ان کا پہنانے والا اپنے جذبہ خلوص کی تمام
پہنائیوں کے ساتھ ان کو لیے کھڑا رہے! اور قیامت تک کھنکتا رہے!
لیلیٰ ان کو پہن لو ۔ ان کو ہاتھ پاؤں میں ہی نہیں بلکہ گلے میں ڈال لو
لیکن میں ڈرتی ہوں کہ کہیں آفتیں گلے میں نہ پڑ جائیں اور لینے کے
دینے اور جان کے لالے نہ پڑ جائیں!

اب دیکھنا یہ ہے کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتی ہوں
یا اپنے مجنوں کی مجنوں بنکر شکست فاش کھاتی ہوں!

مجھے یہاں یہ ضرور لکھنا چاہئے کہ میر صاحب کی دلکش صورت
اور ہنگامہ آرا محبت ہمیشہ جنوں کی سلاسل کو ٹھکراتی رہی اور پہننے
میں آڑے آتی رہی

کتنے تعجب کی بات ہے کہ میں ایک تلوار ہو کر دو نیام پیدا
کر چکی ہوں ۔ مگر کسی میں بھی داخل ہونے سے گریزاں اور بہت
پس و پیش کر رہی ہوں ۔ اور شمشیر بے نیام کی طرح ہمیشہ عریاں کھنچ
رہنا چاہتی ہوں

حالانکہ شمشیر زنی سے بحیثیت ان تھک جاتی ہوں مگر قتل و غارت
جاری رکھتی ہوں

خدا جانے کب تک میں شمشیر براں رہوں گی اور کب داخل نیام ہوں گی

اور ہوں گی بھی یا نہیں!

۳/ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء

رات کے بارہ بجے کے قریب مکان کے باہر ایک موٹر آکر رکی۔ حاضرین محفل کی اور میری توجہ اُس طرف منعطف ہوئی۔ اتنے میں ایک معمولی اور شاید نوکر کی وضع کا ایک آدمی اوپر آیا اور اُس نے مجھے ایک لفافہ دیا جس کو میں نے دیکھتے ہی خیال قائم کیا کہ ہو نہ ہو یہ مجنوں صاحب کی جنوں آفرینی ہے۔ عبارتِ خط مندرجہ ذیل تھی:۔

لیلیٰ!

تسلیم

خط ہذا کے دیکھتے ہی موٹر میں سوار ہو جانے اور مجھے جلد ملئے۔ بہت ضروری کام ہے۔ اُمید ہے کہ آپ آنے میں کوئی تامّل اور تاخیر نہ کریں گی"

خط کو پڑھ کر حیران رہ گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی عزیز صاحب جو میری طوائفیت سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور میرے ساتھ تخلیہ سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں۔ آج اسقدر بیتابی کیا اور وہ بھی توقع کے ذوق و شوق کے ساتھ مجھے کیوں بلا رہے ہیں؟—

سوچتے سوچتے میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ ممکن ہے زاہد و صہبا تھوڑے سے جا تا رہا ہو اور زاہد پارسا نے پیر مغاں اور ساقی و صہبا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں ـــــــ میں فاتحانہ مسکرائی اور حاضرین مجلس سے معذرت چاہ کر اپنے کمرے میں آئی اور جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے اس شخص کے ہمراہ موٹر میں سوار ہو گئی۔ یہ شخص واقعی ایک نوکر تھا اور بہت بیوقوف تھا۔ میرے سوالات کو اول تو سمجھا ہی کم اور جواب بھی دیا تو محض اپنے سرکار کی تعریفوں کے پل باندھتا رہا۔ طرفہ یہ کہ اس کو اپنے سرکار کا نام تک یاد نہ تھا۔ یا نام لیتے ہوئے شرماتا تھا۔ بہر کیف چند منٹ کے بعد موٹر ایک بنگلہ کے احاطہ میں رکی اور جیسے ہی میں برآمدے میں داخل ہوئی تو ساز اور گانے کی آواز آنے لگی۔ جس سے میں بیحد متعجب ہوئی اور اپنے مجنوں کو چھپا ہوا رستم متصور کرنے لگی۔ بڑھتے بڑھتے جیسے ہی کمرے میں پہنچی تو دیکھا کہ وہاں کئی طائفے اور ساز ندے موجود ہیں اور حاضرین محفل کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے مجمع پر ایک چھچلتی سی نظر ڈالی محفل کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ میری نظر کا میر صاحب نے نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ میر صاحب پہلے سے کھڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میں میر صاحب کو یہاں دیکھکر خوش ضرور ہوئی لیکن اس کی خیال سے بیحد پریشان ہوئی کہ عزیز صاحب سے اور ان سے کیسے بنے گی اور میں اپنے آنے کی وجہ میر صاحب کو کیسے بتا سکونگی۔ طوعاً و کرہاً ان دونوں کے جھگڑے کی طرف بڑھی لیکن میر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور ایک خالی کمرے کی طرف بلایا۔

میں نے گھبرا کر ہر طرف نظر ڈالی مگر عزیز صاحب کی صورت کہیں دکھلائی نہ دی۔ میں نے خیال کیا کہ حسب عادت کسی کونہ میں منہ چھپائے گردن جھکائے بیٹھے ہوں گے لیکن میر صاحب کی دل شکنی کے خیال سے مجمع سے باہر نکلکر خالی کمرے میں پہنچ گئی میر صاحب نے میری آمد کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے میری توہین نہیں کی" ——

میں حیران رہ گئی۔ انھوں نے پھر کہا" واقعہ یہ ہے کہ میر بہت سے معزز دوست تمہارے دیکھنے اور گانا سننے کے بیحد مشتاق تھے۔ اسی لیے میں نے بے وقت تم کو تکلیف دی" میں نے گھبرا کر پوچھا" تو کیا خط آپ نے لکھا تھا"؟ انھوں نے اقرار کیا۔ اور پوچھا" آپ نے کس کا خیال کیا؟ گھبراہٹ میں میری زبان سے نکلا ——" عزیز صاحب کا" میر صاحب پر سکتہ کا سا عالم طاری ہوا اور وہ بحر فکر میں غرق ہو گئے۔ میں نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اور اس خط کو محرم سے نکالکر پھر دیکھا۔ تو واقعی اس پر عزیز صاحب کا نام نہ تھا۔ بلکہ میر صاحب کے شکستہ دستخط تھے۔ لیکن عبارت اسقدر مختصر تھی اور میں اتنی جلدی میں تھی کہ خط نہ پہچان سکی۔ بیحد خجل اور پریشان ہو گئی ——— آخرش میں نے سنبھلکر کہا ——" تو کیا آپ بلاتے اور میں نہ آتی! میر صاحب نے تول تول کر کہا ——" لیلی! میرا خیال تھا کہ تم کو بے سروسامانی کے ساتھ محض محبت کے بھروسہ پر بلانے والا میرے سوا اور کوئی نہیں ہے ——— مگر ——— میرا خیال غلط نکلا" اس جملہ کا جواب میرے پاس واقعی کچھ نہ تھا۔ تاہم میں نے بات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔" غالباً ان کو بھیجے

ہوگیا کہ آپ نے آج تک دو چار بار کے سوا کوئی خط نہیں لکھا۔ انھوں نے تعجب کے ساتھ کہا " اور وہ آپ کو روزانہ خط لکھتے ہیں!"۔ میں نے ارادہ کیا کہ جھوٹ بولدوں مگر نہ بول سکی اور جلدی میں "ہاں" کہہ گئی۔ اب میر صاحب کا رنگ بدلا وہ متوحش ہوگئے اور مجھ کو کمرے میں تنہا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ اور مجھے لینے کے دینے پڑ گئے۔ کچھ دیر کے لیے حواس مختل ہو گئے۔ کرتی تو کیا کرتی؟ کمرے سے باہر نکلی مگر میر صاحب کہیں دکھلائی نہ دیئے میں کمرے کے باہر دروازے پر کھڑی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں ٹھ دس خوش پوشش نوجوان میری طرف آئے اور میں نے ان میں سے سردار صاحب اور مرزا صاحب کو فوراً پہچان لیا۔ میری جان میں جان آگئی۔ سردار صاحب نے چھوٹتے ہی میر صاحب کو پوچھا۔ میں خاموش رہی۔ پھر مرزا صاحب نے بھی پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ اور میر صاحب کو تلاش کرنے لگے۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کمرے میں چلی جاؤں۔ چنانچہ پھر کمرے میں چلی آئی۔ اور میرے ساتھ ہی باقی آدمی بھی کمرے میں داخل ہوگئے۔ میں نے واقعہ بتانے میں احتیاط سے کام لیا۔ اور فقط یہ کہا کہ میر صاحب مجھ سے یہاں ٹھہرنے کے لیے کہہ گئے ہیں اور کسی کام کی غرض سے باہر گئے ہیں۔ مگر سردار صاحب اور مرزا صاحب کو یقین نہ آیا۔ الغرض کچھ دیر خاموشی قائم رہنے کے بعد ایک صاحب بولے۔ "عبدالغنی صاحب اپنا ر

میر صاحب خوش نصیب ہیں جو لیلیٰ سی حسین عورت اُن سے محبت کرتی ہے" ایک اور صاحب نے فرمایا "واقعی لیلیٰ کو جیسا سنتے تھے ویسی ہی صاحب جمال ہے" ایک تیسرے صاحب گویا ہوئے۔ "مگر کیا ہمارے میر صاحب کم خوبصورت ہیں!" چوتھے صاحب نے تو غضب کر دیا اور کہا۔ "اسکو تو لیلیٰ سے پوچھنا چاہیے" یہ سنتے ہی سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اور ان چوتھے صاحب نے پوچھا۔ "کیوں لیلیٰ! سچ سچ بتلائیے کہ میر صاحب کتنے خوبصورت ہیں؟" میں اس جملہ کو سنکر مسکرائی اور کچھ شرما گئی۔ دوبارہ جواب کی طلبی ہوئی۔ میں نے آخرکار کہدیا۔ "خوبصورت تو واقعی ہیں اور اچھے بھی ہیں۔ مگر نخرے بہت کرتے ہیں" ایک پانچویں صاحب نے فوراً کہا۔ "یہ بھی آپ نے ہی سکھائے ہوں گے" اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اور شاید نصف گھنٹہ کے بعد میر صاحب معہ عزیز صاحب کمرے میں داخل ہو گئے۔ دونوں کی صورت دیکھتے ہی میں کانپ اٹھی۔ اور مجھے عمر میں پہلی مرتبہ یہ خیال آیا کہ کاش! میں ان دونوں مردوں سے بیک وقت شادی کر سکتی! اور قانون اور معاشرہ اس کی اجازت دیدیتا! ——— لیکن فوراً مایوس ہو گئی اور بھوکی ہو کر عزیز صاحب کی صورت دیکھنے لگی کیونکہ میر صاحب نے دانستہ موقعہ دیا اور وہ خود سردار صاحب سے سرگوشیوں میں مشغول ہو گئے جس چیز نے مجھے تعجب میں ڈالا وہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو عزیز صاحب سے واقف تھے۔

اور جو واقف بھی تھے وہ اُن سے بے تکلف نہ تھے یا تو ادب کرتے تھے یا نفرت کرتے تھے۔ یا کیا؟ ——— بہر کیف عزیز صاحب نے بمشکل گردن اٹھا کر آنکھ سے آنکھ ملائی اور جلد ہی ہٹالی کوئی گفتگو نہ ہوئی اور میر صاحب نے ستم ظریفی یہ کی کہ سب لوگوں کو لیکر گانے کے ہال میں چلے گئے۔ اب میں اور صرف عزیز صاحب اس کمرہ میں رہ گئے۔ میں نے ان کو تمام واقعہ سنا دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنکر کہنے لگے "ہاں! تو آپ نے مجھ کو یہاں نہیں بلایا تھا۔ بلکہ یہ میر صاحب کی ستم ظریفی تھی کہ مجھ کو دھوکہ دیکر یہاں لائے۔ اور ——— ہاں! آپ کو مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے"؟ میں نے کہا "نہیں! کوئی ضروری کام تو نہیں ہے"۔ عزیز صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور چند سکنڈ تک برابر دیکھتے رہے۔ کتنی نوازش ریز نظر تھی عزیز صاحب کی! بخدا جسم میں لرزہ پیدا ہو گیا اور دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ میں نے چاہا کہ اُن کو آغوش میں لے لوں اور کہدوں کہ میں واقعی ان کو میر صاحب سے زیادہ پسند کرتی ہوں۔ لیکن انھوں نے اتنا موقعہ نہ دیا۔ "اچھا! خدا حافظ"! کہکر کمرے سے چلے گئے اور میں اکیلی کی اکیلی رہ گئی۔ اب میرے قلب کی عجیب حالت تھی۔ اور میں یہاں آنے پر تاسف کرنے لگی ——— کچھ دیر بعد سردار صاحب تشریف لائے۔ اُن کو سب واقعات میر صاحب سے معلوم ہو چکے تھے۔ کہنے لگے "اب کیا ارادہ ہے"؟ میں نے جھلا کر کہا۔ "میں اب گھر جانا چاہتی

ہوں گے۔ سردار صاحب نے کہا " مگر میر صاحب تو تم کو محفل میں بلا رہے ہیں "۔ میں نے سختی کے ساتھ انکار کیا۔ تھوڑی دیر بعد میر صاحب خود تشریف لائے اور اپنی موقف کی نزاکت جتانے لگے۔ بہر نوع مجھے محفل میں جانا پڑا اور حسب فرمائش گانا پڑا۔ مگر ناچ سے میں نے انکار کر دیا۔ میر صاحب بگڑ گئے اور میری خواہش کے مطابق مجھ کو موٹر میں سوار کرا دیا گیا۔ اور میں مکان پہنچ گئی تمام واقعات پر غور کرتے کرتے لیٹ گئی۔ لیکن مجھے یہ یقین ہونے لگا کہ میر صاحب مجھے اب نہ ملیں گے اور شائد ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جائیں گے ـــ اس خیال کے قائم ہوتے ہی میری نیند اڑ گئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں نے اپنی دنیا آپ بگاڑ لی ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں آفتاب طلوع ہو گیا۔ مگر مجھے اپنی امیدوں کا سورج ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور صبح کا اجالا مجھے اندھیری راتوں سے زیادہ تاریک نظر آ رہا تھا۔ ـــ صبح کی ہوائیں میرے جسم کو نظر بد کی طرح لگ رہی تھیں۔ ـــ میری مایوس انگڑائیاں۔ میری روح نکال رہی تھیں۔ میری جمائیاں مجھے خواب رجائیت کی موت کا پیام دے رہی تھیں! میرا دماغ سر کی ہڈیوں کے صندوق سے باہر نکلا جا رہا تھا! اور میری آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہونا چاہ رہی تھیں۔ لیکن بیم و رجا کی خیالی جھلک بہر آن دھمکیاں دے رہی تھی۔ میرا قلب ماؤف تھا۔ سینہ کاوی کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر ہاتھ امید کے خیالی دیوتا کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اور مجھ کو اپنے دست و پا پر کوئی اختیار نہ تھا۔ کروٹیں لے رہی تھی بے چین ہو رہی تھی

دم گھٹ رہا تھا۔ کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ دھوں پر بن رہی تھی۔ حتیٰ کہ دل سے ابخرات اٹھے۔ غم کے بادل بنے۔ چشم نیلی فام پر چھا گئے اور سرد آہوں سے اتنے منجمد ہوئے کہ بیحد وزنی ہو گئے۔ یاس کی بجلی چمکی۔ خوف کے بادل گرجے۔ ترشح ہونے لگا۔ قطرے ٹپکنے لگے واہن عارض تر ہونے لگا۔ دریا بہہ گئے۔ چشمے ابل پڑے فضا میں خنکی پیدا ہوئی۔ ہوائیں ٹھنڈی چلنے لگیں۔ لوریاں دینے لگیں میرے قلب میں سکون کی لہر دوڑنے لگی طوفان خیال ختم ہو گیا۔ آنکھیں جھپکی اور بند ہو گئیں اور میری تمام کیفیات سمٹ کر سکڑ کر میرے ساتھ سو گئیں۔

۲۳/نومبر ۱۹۳۰ء

پچھلے دنوں کے مایوس کن اور ناخوش گوار واقعات نے میری خیالی فضا کو مکدر اور مستقبل کے مطلع کو دھندلا بنا دیا تھا اور میں اس کوشش میں مصروف ہو گئی کہ نکاح کے خیال کو ہی ہمیشہ کیلئے فنا کر دوں اور عشق و محبت کی سلطنت کو تاخت تاراج کر کے آگ لگا دوں اور اور سب سے پہلے یہ کر دوں کہ میر صاحب کی یاد کو صحیفۂ قلب سے

ایک قلم مٹا دوں ــــ اور اپنی خالہ اور ماں کے نقش قدم پر آنکھ بند کرکے چلنے لگوں ــــــــــــ ابھی دوران میں عزیز صاحب کے بھی کئی خطوط حسب معمول آئے جن کے میں نے جلے کٹے جوابات لکھ بھیجے۔ ممکن ہے انھوں نے بھی ناک بھوں چڑھائی ہو اور مجھ پر لعنت بھیجی ہو ــــــــــ میں ان کو بھی بھولنا چاہتی ہوں ــــــــــ

بڑے بڑے نخرے کرتے ہیں یہ مرد جب ان کی بن آتی ہے!! ابتداً بھیگی بلی اور پالتو کتے کی طرح غُرغُر کرتے دم ہلاتے پھرتے ہیں۔ لیکن جہاں اُن کو منہ لگایا اور محبت کا یقین دلایا یہ بگڑے پنجے نکالے۔ غرّائے اور کاٹنے کو دوڑے۔ ایسے آنکھیں بدلتے ہیں۔ ایسے نخرے کرتے ہیں۔ ایسی کللیلیں کرتے ہیں جو ان کی ذات گیلیے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہوتیں۔ اور اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہمیں معتوب کرتے ہیں۔ نخرے باز بتاتے ہیں۔ اور بیوفا بھی کہتے ہیں۔

لیکن میری کوشش اور میرے ارادے سب بیکار ثابت ہوئے اور میں میر صاحب کو دل سے نہ بھلا سکی۔ ان کی محبت کی گرمجوشیاں۔ ان کی آغوش کی گرمیاں۔ صحبت شب کی سرمستیاں۔ ان کی رفتار گفتار کی دلفریبیاں۔ اور موہنی صورت کی سحر سازیاں اور جلوہ طرازیاں۔ یاد آآکر ستانے لگیں۔ قلب کو گرمانے لگیں اور دماغ کو برمانے لگیں ــــــــــ میر صاحب! جلوت میں جی دبنے والے! خلوت میں دل لینے والے اور یاد میں بیکل بنانے والے میر صاحب! خدا

تجھ کو بھی میری طرح ہمیشہ بےچین رکھے! ۔۔

یہ میں لکھ گئی! آخرش دل کی صدا لکھ گئی ۔ اس کو لکھا ہی رہنے دو۔
مجھے اس نوشتہ سے سکون ہوتا ہے ۔
میر صاحب! میر صاحب! ظالم ۔ سفاک
بیرحم!

۱۱/ دسمبر ۱۹۳۰ء

نا فراموش کر سکی! نہ بھلا سکی! کچھ بھی نہ بھول سکی ــــ
اور بھلائی بھی نہ جا سکی ــــ اب میر صاحب نے بھی محبت کے
شعلوں کو کاغذ میں لپیٹ کر بھیجنا شروع کر دیا ۔ جنھوں نے مجھے پھر
جلانا شروع کر دیا ــــ ستانے کے بعد جلانا! اور پہلے خود جلنا!
کیا ہے یہ جلنا جلانا! ــــ نہ جلتے ہیں نہ بجھتے ہیں ــــ
سلگتے ہی رہتے ہیں یہ انگارے! محبت کے شرارے! عشق کے
شعلے! ــــ دل کے کوئلوں کی دہکتی ہوئی آگ!
التہابِ شمعِ محبت! ــــ عشق کی فطرت آتش ہی معلوم

ہوتی ہے۔ عاشقوں کو آتش پرست ہونا ہی چاہئے۔ مسلکِ زرتشتی اور عشق پرستی میں یہی فرق معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میں سامانِ سوزش لکڑیاں ہوتی ہیں اور دوسرے میں جذبات و حسیات جسم و روح اور دل و دماغ سب ہی جلانے پڑتے ہیں۔ اور التہابِ عشق۔ یونہی برقرار رہتا ہے۔ اس محبت کی آگ کو انسان روزِ اول سے قائم رکھنے پر مجبور ہے۔ آتشکدۂ دل میں جہاں تنویرِ حسن نے کوئی چنگاری پیدا کی تو یہ سلگی۔ پھر اس کا بجھانا قبضۂ انسان سے باہر ہے۔ جلتی ہی رہتی ہے! جلاتی ہی رہتی ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

دل کی بھٹی کے شعلے جب بھڑکتے ہیں تو برق بنجاتے ہیں اور برقِ حسن سے ٹکرا ٹکرا کر کوندتے اور چمکتے ہیں اور عقل کی آنکھوں کو چکا چوندھ کرکے اندھا بنا دیتے ہیں۔ تب انسان گرتا پڑتا ہے اور خوب ٹھوکریں کھاتا ہے۔ جذباتِ نہانی اب دل کی آنکھ پیدا کرتے ہیں اور اس پر آتشی عینک لگاتے ہیں۔ اپنے سیاہ و سفید کو بھی ہرا ہی ہرا دیکھتے ہیں اور خزاں کو موسمِ بہار سمجھکر سیرِ گلشن کے لیے نکلتے ہیں سینہ چاک، نالہ کناں! ۔ فریب پر فریب کھاتے ہیں۔ اور اسی کو منزلِ مقصود تصور کرتے ہیں۔

میں کلیجہ میں آگ محسوس کرتی ہوں۔ عقل کی آنکھیں کھو چکی ہوں۔ دل کے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں۔ مگر نور کے اکتساب کا ذریعہ

مفقود ہے۔ کہاں بہار! — کہاں نغمہ سنجی! ———
ٹٹول رہی ہوں۔ کچھ کھو گیا ہے آنکھوں کے سامنے کھویا جا رہا ہے۔
تلاش ہے۔ پا ہی نہیں رہی ہوں — سراب آسا سایہ سامنے ہے
بھاگا جا رہا ہے۔ بھاگ رہا ہے۔ بہت تیز بھاگ رہا ہے۔ اللہ رے بعد!
اللہ ری دوری! دن دہاڑے سرقہ اور چوری اور پھر سینہ زوری!
مجھ سی شمشیر زن! پیر صاحب ساڈاکہ زن! بزن! بزن! اے مرد میدان
زن! تسمہ نہ لگا رہنے دے! متاع دل کے ساتھ صبر و قرار بھی
لوٹ لے! میں بہ بانگ دہل اعتراف شکست کرتی ہوں آ جا۔ اور فتح
کی ہوئی سلطنت پر ترکتازانہ قبضہ جما لے۔ اور حکومت شروع کر دے۔
جابرانہ ہی سہی۔ مستبدانہ ہی سہی۔ بے نیازانہ ہی سہی مگر دل کی نگری کو
اجاڑ کر ویران نہ چھوڑ! اس میں بس جا! رنگیلے راجا اس میں رہ کے
رنگ رلیاں منا لے۔ بنسری بجا لے۔ گا اور خوب گا۔ موسیقار بن کے
دیپک کا راگ چھیڑ۔ پرپرزوں میں آگ لگا دے اور مجھ کو بھی ققنس
بنا دے۔ تعمیر آتش کا راز سکھا دے فنا کی راہ دکھا دے! خاک
بنا دے طوفان میں اڑا دے! بگولہ بنا دے۔ خود صحرا بن جا! اور اڑ [illegible]
اڑتی رہوں گی آسمانی فضاؤں میں! طوفانی ہواؤں میں۔ چکور! چاند
کی طرف! کبھی نہ تھکوں گی! کبھی نہ رکوں گی! ہمت نہ ہاروں گی
قربان ہو کر رہوں گی۔ چاند پر! بعید ترین چاند پر! نثار ہو جاؤں گی!
فنا ہو کر ستارہ بنوں گی! اور چاند کے قریب! چاند کی آغوش
میں چمکوں گی! جھلملاؤں گی! شرما شرما جاؤں گی! [illegible]!

مگر قربت نہ چھوڑوں گی! جگمگاؤں گی! شاہ خاور سے ڈر و ڈر جاؤنگی! روز روشن میں کسی کو منہ نہ دکھاؤں گی! چادر شب پاؤں پھیلاؤنگی۔ بخت خفتہ کو جگاؤنگی! اطراف بھروں گی! نکھروں گی سنوروں گی اور ہر شب چمکتی ہی رہوں گی! ضیائے قمری کو اندھیری راتوں میں بھی قائم رکھونگی! اور اپنے ماہ منور کا سکہ جمایا کروں نگی! میر صاحب شعلہ خو! میرے ماہرو! لمعات محبت! تنویر طریقت! اے ماہ سرو مہر! ؎

گردش ہے فلک کی اور تاریک ستارہ ہے
گردے تو ضیاء باری صدقے ترے چمکادے

نہ آئے پر نہ آئے! روٹھے رہے! نہ منے! اپنی سے باز نہ آئے! اپنی پہ آہی گئے! اللہ ری جفاکاری! اللہ ری دل آزاری! میر صاحب! فتنہ پرور! حسن کا ڈاکو! لٹیرا! غارتگر شکیب! رحم! خدارا رحم! ——— ———

——— ! ——— ! ———

———

۱۷/ دسمبر ۱۹۳۰ء

مایوس محبت۔ ناکام محبت۔ بحر الفت میں ڈوبی جا رہی ہوں

غوطے لگا رہی ہوں ۔ تنکے کا سہارا ڈھونڈھ رہی ہوں ۔ شریک شناوری تیر رہا ہے ۔ آگے بڑھا جا رہا ہے مجھے پیچھے چھوڑ گیا ہے ۔ ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں ۔ تند و تیز اور طرار تیراک ہے تیرتا چلا رہا ہے ۔ پیچھے پھر کر بھی نہیں دیکھتا ۔ چلا رہی ہوں ۔ نہیں سنتا ـــــ کاش ! دامن پکڑ لیتا ! ـــ ساتھ بھی چلی جاتی ! ـــ منزل مقصود پر پہنچ جاتی ۔ خدا جانے اس کا رخ کدھر ہے ؟ ـ اس کی منزل کیا ہے ؟ ـــ بحر پیچھے کنارے پر ایک دوسرا بے حس و حرکت انسان کھڑا ہے مشکیں کسنے کی رسیاں ہاتھ میں لیے ہوئے ہے ۔ مگر حرکت نہیں کرتا ۔ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا ۔ پیچھے دیکھتی ہوں تو زوردار آواز میں کہتا ہے لہجہ طنزیہ اور کرخت ہوتا ہے ۔ لیلیٰ ! تم ڈوب رہی ہو ! خود کردہ غلطی ہے جس کا خمیازہ بھگت رہی ہو ۔ اب سمندر کے خمیازہ سے بچو ورنہ دریائے معاصی نکل جائے گا ۔ جو پیچھے ہٹو ۔ میری طرف بڑھو ! اور میری رسیوں کے سروں کو پکڑ لو ۔ ان کے سہارے تیرو ۔ میں تم کو ڈوبنے سے بچا لوں گا بحر ذخار سے نکال لوں گا تم کو خشکی کی خوشگوار فضاؤں اور ٹھنڈی ہواؤں میں لے آؤں گا " ـ روکھا پھیکا انسان اپنی ڈھانک رہا ہے ۔ کیسے پیچھے ہٹوں ! کیسے رسیاں پکڑ دوں ؟ اتنی سکت کس میں ہے ؟ اتنی ہمت کہاں ہے ! ایسے کے ہاتھوں قید کیسے ہو جاؤں ! اور سب سے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ سمجھوں کیسے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ! اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے ؟ اس اتھاہ سمندر میں سیکڑوں اور بھی تیر رہے ہیں اور ڈوب رہے ہیں سب سے میرے

قریب آتے ہیں ۔ مجھ پر پھول برساتے ہیں ۔ پانی کے چھینٹے پھینکتے ہیں اچھالے دیتے ہیں سہارا دیتے ہیں ۔ گود میں لئے ہیں ۔ پیار کرتے ہیں سہارا دیتے ہیں میرا بوجھ اٹھاتے ہیں اور ادھر اُدھر وحشیانہ رقص کرتے ہیں ۔ خوشیاں مناتے ہیں ۔ ہنستے ہیں قہقہے لگاتے ہیں ——

اور پھر مجھے اسی گرداب میں چھوڑ کر ۔ ایسا غوطہ لگاتے ہیں کہ کہیں کے کہیں جا نکلتے ہیں ۔ اور فراٹے بھرتے ہوے لانبے لانبے ہاتھ مارتے ہوے ۔ ڈکارتے ہوئے اور سینۂ سمندر کو چیرتے ہوئے تیرتے ہیں۔ اور اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ ان تک میری نظر بھی نہیں پہنچ سکتی مجھے جس چیز پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب ایسے لوگ مجھے دور سے دیکھتے ہیں تو اس تیزی سے اور شوق سے میری طرف بڑھتے ہیں کہ ان میں سے بعض تو دوسرے ساتھ تیرنے والوں کی گردنیں پکڑ کر ڈبا دیتے ہیں اور اپنا راستہ صاف کر کے بجلی کی سرعت کیساتھ میرے قریب پہنچتے ہیں اور پہنچتے ہی دبوچ لیتے ہیں ان کے منہ میں پانی بھرا ہوتا ہے ۔ رال ٹپکتی رہتی ہے ۔ جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں فوراً مجھے سنبھال کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں شوق و ذوق کی گرمی ان کو بے چین کر دیتی ہے ۔ اور یہ ناچنے لگتے ہیں ۔ اور بقدر ہمت خوب گردش کرتے ہیں ۔ لیکن جیسے ہی رقص ختم ہوا یہ بھی ختم ہوئے اور رخصت ہو گئے ۔ کبھی پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے ۔ بلکہ دوسرے تیرنے والوں کی نظروں سے بچنے کے لیے ڈبکیاں لیتے ہوئے منہ پانی میں چھپاتے ہوئے انتہائی تیزی سے تیر کر دور نکل جاتے ہیں ——

یہ میرا عجیب مشاہدہ ہے کہ "جو جتنی تیزی سے آتا ہے اتنی ہی تیزی کا سے بھاگتا ہے"۔

بعض تیرنے والے ایسے بھی ہیں جو سلامت روی سے تیرتے ہیں اور اپنی منزل کی طرف سیدھا رخ کیے چلے جاتے ہیں اور میری طرف بھول کر بھی نہیں دیکھتے میں ان آہستہ اور سیدھا تیرنے والوں کو خوب پہچاننے لگی ہوں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سمندر میں کپڑا پہن کر کودتے ہیں اور کپڑا پہنے ہی پہنے تیرتے ہیں لیکن تیز رو اور میری طرف لپکنے والوں اور رال ٹپکانے والوں کی علامت یہ ہے کہ وہ ننگے ہوتے ہیں۔ بالکل ننگے! البتہ بعض کے پاس لنگوٹی ہوتی ہے۔ وہ قریب ضرور آتے ہیں۔ تیزی سے آتے ہیں لیکن پاس سے نکل جاتے ہیں۔ اور رقص بحری میں گردشیں نہیں کھاتے اور مجھے بھی نہیں ستاتے۔

مجھ کو کبھی کبھی اپنے ہیر صاحب پر انھیں لپکنے والوں اور ننگے تیرنے والوں کا شبہ ہوتا ہے ــــــ یا ــــــ یہ جامے سے باہر ہو گئے ہیں ــــــ یا ــــــ لنگوٹی تک نہیں رہی! یا پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے ہی آنکھ سے ڈھل گیا ہے ــــــ یا ــــــ شاید کلیجہ ٹھنڈا کر کے جل ٹھنڈے ہو گئے ہیں!

بہر کیف خدا جانے ان کو کیا ہوا ہے۔ آگے بھاگے جا رہے ہیں ــــــ اگر وہ خدانخواستہ بھوکے ننگے ہو گئے ہیں تو مجھے کب

زیب تنی یا زیبائش کی ضرورت ہے۔

ادھر عزیز صاحب پوری طرح ملبس ہیں کنارے پر کھڑے ہیں۔ زاہد خشک ہیں۔ خشکی پسند ہیں شاید خود بھی خشک ہوں بلکہ درشت ہوں! رسے لیے پھرتے ہیں۔ سمندر سے اجتناب ہے۔ شناوری سے حجاب ہے۔ خود صبغت جناب کی طنز و عتاب اور پیچ و تاب ہے۔ سمندر میں نہیں کودتے لینا سب کچھ چاہتے ہیں۔ لیکن رسید تک نہیں دیتے پاس نہیں پھٹکنے! بلاتے ہیں آواز پر آواز دیتے ہیں۔ سُن سُن کر تھک جاتی یا بگڑ جاتی ہوں تو آواز سے کستے ہیں۔ خوب برستے ہیں —— —— ہاں! کبھی کبھی آنسو کے موتی بھی برستے ہیں۔ اور انکی قدر و قیمت بھی بتاتے ہیں —— لیکن گرفتاری کی فکر رکھتے ہیں —— بھلا کوئی خود بھی گرفتار ہوتا ہے وہ بھی پیچھے ہٹ کر سیتھے چڑھے اور پلٹ کر! میں ننگی —— وہ ستر پوش —— میں تری کی رہنے والی اور تر دامن! وہ خشکی کے بسنے والے اور پاکدامن!

وہ رسیوں کو ڈھیل دے رہے ہیں۔ اُن کے سرے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ رسیوں کے گھیرے کنڈل ہوئے جا رہے ہیں حلقے بنے جا رہے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ بڑھتے چلے آ رہے ہیں —— میں ڈوب جانے کا خوف کھا رہی ہوں۔ رسیوں کو پکڑنا چاہتی ہوں۔ مگر اُن کے حلقوں سے ڈرتی ہوں۔ کہیں ان میں پھنس نہ جاؤں اب۔ دیکھنا ہے

کہ پھنستی ہوں اور گھٹتی ہوں یا کتراتی ہوں اور کاٹتی ہوں ——— اگر گرفتار ہو ہی گئی تو پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ رسیاں مجھے کھینچتی ہیں یا میں اس کمند باز کو سمندر میں کھینچ لیتی ہوں! اور یہ تو بالکل معلوم نہیں کہ ہم دونوں خشکی میں رہیں گے یا تری میں؟ اور اگر خشکی میں و ہے تو زمین کے رہنے والے ہمیں رہنے بھی دیتی ہیں یا سمندر میں ڈالتے ہیں!

خدا جانے کیا ہوگا؟ کیا ہو کر رہے گا؟ مجھے تو یہ بھی پورے طور پر معلوم نہیں کہ ہو کیا رہا ہے — مجھے کیا ہو گیا ہے اور میرے خدا کو یہ کیا ہوا کہ ہے؟ یا ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے! ———

——— شائد ایسا ہی ہوتا ہو گا! ———

۲۹/دسمبر ۱۹۳۰ء

آخر کار میں معاشرہ کے معینہ اور مروجہ قوانین کی روشنی میں ۲۷/دسمبر ۳۰ء کو اس نتیجہ پر اضطرار اً پہنچی کہ عورت کو اس شخص سے شادی نہیں کرنی چاہیے جس کو وہ خود چاہے بلکہ اس مرد سے شادی کرنی چاہیے جو اس کو چاہے۔ یا نہ چاہ کر خواہاں ہوں۔ یعنی عورت کو اپنے کسی محبوب سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ اس کو اپنے کسی عاشق سے یا خواہاں سے شادی کر لینا ضروری ہے بالفاظ دیگر میں یہ

گھون گی کہ معاشرہ (سماج) نے یہ ضروری ہی نہیں سمجھا کہ عورت کو بھی تعشق کا حق عطا فرمائے حالانکہ اس کا جواز عین اقتضائے فطرت و بشریت ہوتا۔ لیکن مرد نے جہاں تک اُس کا بس چلا ہے عورت کو بے کس رکھا ہے۔ افسوس یا بدنصیبی ہے کہ عورتیں ان مردوں کے بنائے ہوئے قوانین کو بھی کبھی ٹھکرا دیتی ہیں اور ٹھوکریں کھاتی ہیں۔ اگر اقتصادیات اور معاشیات اور حصول معاش میں صنفی مساوات ہوتی تو یقیناً مردوں کو معاشرتی قانون سازی میں سبقت اور اپنا پلہ بھاری رکھنے میں کامیابی نہ ہوتی۔ بلکہ وہ مساوات کو قائم رکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ لیکن متذکرہ بالا شعبوں کے غیر ہموار ہونے سے غریب عورت کو ہر جگہ شکست پر شکست ہوتی رہی اور وہ بدرجہ مجبوری ہتھیار ڈالتی رہی اور پستی کی طرف ڈھکیلی جاتی رہی حتیٰ کہ شکست اور پستی اس کی عادت ثانیہ بن گئی اور مرد مجلس قانون سازی کی صدارت کرتا رہا اور اس مجلس کی رکنیت کے دروازے کو عورتوں پر بند رکھا۔ کوئی مجھ جیسی اگر گھس بھی آئی تو نقار خانے میں طوطی کی آواز بنکر رہ گئی ــــــ

کیا کیا عجیب قوانین بنائے ہیں اس معاشرے نے! خدا کی پناہ عصمت اور پاکدامنی کے لفظ کو تصورتی کے ساتھ ساخت کیا اور عورت کی پیشانی پر کندہ کر دیا۔ اور اس کو عورت کی قدر و منزلت اور عزت و حرمت کی امتحانی یا تجارتی تختی (سائن بورڈ) سمجھا۔ لیکن مردوں نے اپنے لئے اس لفظ کو بالکل غیر ضروری سمجھا۔ کیونکہ اُن کو یقین ہے کہ وہ اپنا کالا منہ کرنے سے نہیں بچ سکتے۔ اور

ان خفیہ لذائذ کو ترک نہیں کر سکتے ۔ لیکن یہ کبھی نہ سوچا کہ ناجائز مباشرت کا ارتکاب عورت یا مرد تنہا نہیں کر سکتے ——— یہ ایک ایسا جرم ہے جس کا ارتکاب بغیر اشتراک مرد و زن ہو ہی نہیں سکتا ۔ لیکن معاشرہ نے ان میں سے ایک مجرم کو گردن زدنی ٹھہرایا اور دوسرے کو بالکل قابل معافی سمجھا ۔ ایک عورت محض ایک بار ناجائز مباشرت کا ارتکاب کرتی ہے اور عمر بھر کے لیے بے حرمت و بے غیرت متصور ہونے لگتی ہے ۔ اور خاندان اور برادری کے لیے باعث ننگ بنجاتی ہے اور اس سے کوئی مرد شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ۔ لیکن مرد ۔ بقول زبردست کا ٹھینگا سر پر ۔ ستر بار ۔ بلکہ ہزار بار زنا کرتا ہے مگر اس کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا اس کو بے عصمت کوئی نہیں کہتا ۔ اس کے بیاہ شادی میں کوئی رکاوٹ واقع نہیں ہوتی ———
شوہر بیوی کو اپنی عزت کہتا ہے لیکن بیوی اپنے شوہر کو عزت محض کہہ سکتی ہے مگر باطناً سمجھ نہیں سکتی ۔ حالانکہ وہ اس کی زیادہ مستحق ہے ۔ ایک بیوی مرتکب زنا ہوتی ہے ۔ شوہر اس کو گولی سے مار دیتا ہے ۔ یا گھر سے نکال دیتا ہے کیونکہ وہ معاشرہ اور قانون کے سامنے یہ کہتا ہے " ایسا ہونے سے میری عزت چلی گئی ! لیکن شوہر زنا کا ارتکاب دھڑلے کے ساتھ کرتا ہے بیوی اس پر گولی چلانا کیا معنی چھری بھی نہیں چلا سکتی ۔ بلکہ قینچی چلانے کی بھی اس کو ممانعت ہے ۔ بیوی اگر سوسائٹی (معاشرہ) کے سامنے یہ کہے کہ شوہر کے ایسا کرنے سے میری عزت چلی گئی تو معاشرہ اس کا برداشت

نکال کر ہنستا ہے! اور بیوی مرد کو گھر سے باہر تو کبھی کسی حالت میں بھی نہیں نکال سکتی ـــــ حالانکہ مرد۔ ستم ظریف مرد! بیوی کو "گھر والی "گھر کی ملکہ۔ کے ایسے ناموں سے پکارتا ہے ـــــــــ اس گھر کی ملکہ کو مرد جب چاہے نکال باہر کر سکتا ہے مگر یہ اپنے گھر پر تسلیم شدہ ملکیت رکھنے کے باوجود مرد کو کبھی بھی مِلک سے محروم نہیں کر سکتی!۔

"بدصورت" "پھوہڑ" ایسے الفاظ مردوں نے بنائے لیکن ان کا عملی اطلاق محض عورتوں پر روا رکھا۔ عورت کو بدصورت اور پھوہڑ کہہ دیا۔ اور اس کا ہر ایک حق چھین لیا شادی سے انکار کر دیا۔ ناقابل التفات بلکہ قابل سرزنش سمجھا۔ لیکن عورت کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ بدصورت مرد کو بدصورت کہہ دے اور شادی سے انکار کر دے۔ یا غیر منظم مرد کو پھوہڑ کہہ دے اور اُسے تنبیہہ کرے! یا شادی سے انکار کر دے!

"خطا" "معافی" ۔ یہ دونوں الفاظ بھی مرد کی ستم ظریفی کے رہین منت ہیں۔ مردوں نے تسلیم کرا رکھا ہے کہ شوہر سے کبھی کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اور معافی مانگنا تو مرد کے لیے کبھی ضروری قرار دیا ہی نہیں گیا ہے۔ یعنی مرد! زبردست اور غاصب مرد! کہتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ خطا ہمیشہ بیوی سے ہوتی ہے اور معافی ہمیشہ بیوی کو مانگنی چاہیئے۔ حالانکہ خطا کا امکان ہر انسان سے ہے خواہ وہ عورت ہو یا مرد! لیکن سماج کے تنور سے کبھی خطا نہیں ہوتی! اور بیوی۔

سامنے معذرت چاہنا تو مردوں کے سماج کی شان کے خلاف ہے یعنی ان کے نزدیک عورت کی کوئی شان ہی نہیں

"انتخاب" بیحد وسیع لفظ ہے لیکن مردوں نے اس کی وسعت اور پہنائی کو بھی اپنے ہی لیے مخصوص رکھا اور عورت کے لیے اس کو بالکل محدود یا کالعدم کر دیا۔ غرضیکہ دنیا کی کسی شے کو عورت انتخاب کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ اس کو ہر اس شے کو بنظر انتخاب دیکھنا پڑتا ہے جس کو کہ اُس کا شوہر پسند کرتا ہو۔ حتیٰ کہ بیوی ہونے سے پہلے وہ مرد کا بھی انتخاب نہیں کر سکتی۔

"اطاعت"۔ "غلامی"۔ "صبر اور طبیعت پر جبر"۔ یہ سب الفاظ عورت کے لیے لازمی قرار دئے گئے ہیں۔ شوہر کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں تک کہ ایک طوائف کے لیے بھی عشق کی اجازت نہیں۔ وہ اظہار عشق نہیں کر سکتی اور اگر کرتی ہے تو گناہ کرتی ہے جھوٹی قرار دیجاتی ہے۔ لالچی سمجھی جاتی ہے۔ اور معشوق مرد اسکو خوب الو بناتا ہے۔ نخرہ کرتا ہے۔ پھرتا ہے۔ شراب تعیش کے خُم کے خُم لنڈھاتا ہے اور اس سلسلے میں بیوفائی نہیں کرتا کیونکہ اس کی خود خواہش اس کے پیش نظر ہوتی ہے لیکن اگر دائمی نباہ کا سوال اس کے سامنے رکھدیا جاتا ہے تو وہ سٹ پٹا جاتا ہے بوکھلا جاتا ہے ———— کچھ سوچکر بڑی تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن چند روز بعد ہی پیچھے ہٹتا ہے

اور ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتا ہے۔ قریب قریب یہی حالت
شریف عورتوں کی بھی ہے۔ وہ اگر کسی کو اتفاق سے چاہنے لگتی ہیں۔
تو سوائے خاموشی کے اُن کو کوئی چارہ نہیں۔ وہ اپنے محبوب کو دائمی
نباہ کے لیے حاصل نہیں کر سکتیں کیونکہ معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔
لیکن اگر سوئے اتفاق سے کوئی دلیر دوشیزہ اپنے محبوب مرد سے
نکاح کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو اُس پر مرد اور عورت
دونوں نکتہ چینی ہی نہیں کرتے بلکہ بعض دفعہ مقدمے چلاتے ہیں۔
گرفتار کراتے ہیں جھوٹے گواہ پیش کرتے ہیں۔ بالغہ کو نابالغہ
تسلیم کراتے ہیں ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے
لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ سہنے کے بعد بھی۔ یہ سب ایثار
اور قربانی کرنے کے بعد بھی محبوب مرد اپنی نفس پرستی کے بخار کو
اتار کر عورت کے ساتھ بیوفائی اور طوطا چشمی پر اُتر آتا ہے۔ اس کو
نظروں سے گرا دیتا ہے۔ اس کی قربانیوں اور محبت کی صداقت
کو بھلا دیتا ہے حتیٰ کہ اُس کے بھیانک مستقبل کو بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ
اس کو لعن طعن کرنا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اس نے مرد کے بنائے
ہوئے سماج کے قانون کو توڑا ہے یعنی مرد کے ساتھ وفا کی ہے
بالآخر مرد عورت کے معصوم جذبات کو کچل ڈالتا ہے۔ اور ایک روز
اس کی نازک کمر پر ٹھوکر لگا کر۔ قلب کو دھکا لگا کر۔ دھکے دیکر
مکان سے باہر کر دیتا ہے۔ یا اس کو بے یار و مددگار تنہا بے سروسامانی
کی حالت میں چھوڑ کر خود فرار ہو جاتا ہے اور اپنی راہ لگتا ہے ——

کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا کہ اس غریب دکھیاری کا جس نے اپنا سب کچھ اس کی خاطر تج دیا۔ کیا حشر ہوگا! ——————

—————— اس سے زیادہ ظلم وستم اور قہر وغضب کیا ہو سکتا ہے؟

—————— بیواؤں کو دامِ تزویر میں پھنسانا دوشیزہ کو سبز باغ دکھانا۔ اس کے معصوم دل کو موہ لینا۔ شادی کے جھوٹے وعدے کرنا۔ اور ان کو لڑکی سے ماں بنا کر علیحدہ ہو جانا۔ بھاگ جانا۔ بھولجانا۔ بدل جانا۔ انکار کرنا۔ اپنا جرم سیاہ چھپا لینا۔ یہ سب حرکات محبوب مرد! معشوق مرد! کرتا ہے —————— کاش ان مردوں کو بھی حمل قائم ہو جایا کرتا!

——————

اور ان کی مردانگی اور شرافت کی قلعی کھل جایا کرتی اور یہ بھی عورتوں کی طرح اپنی پوشیدہ محبت کے کارناموں کو نہ چھپا سکتے! اور ڈوب مرا کرتے!

——————

متعدد مثالیں میرے پیش نظر ہیں۔ سیکڑوں ہزاروں واقعات کتابوں میں درج ہیں۔ جن میں معشوق مردوں نے عاشق عورتوں کی عزت وحرمت کو بھی خراب نہیں کیا۔ بلکہ دائمی زندگی کو! تمام زندگی کو پایا مال خراب۔ اور ستیاناس کر دیا ہے۔ اور محض چونک کر رہ گئی ہیں اور بس! ——————

بدیں وجوہ میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ عورت کو کبھی کسی مرد سے

عشق نہیں لڑانا چاہئے۔ اور کنواری عورت کو تو مرد کے سایہ سے بچنا چاہئے۔ اور طوائف تک کو معشوق مرد سے کبھی شادی نہیں کرنی چاہئے۔ ورنہ اُس کا انجام خراب ہوگا۔ قابل تلافی بھی نہ ہوگا بلکہ بیحد خوفناک ہوگا!۔ خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے کرم فرما محبوب میر صاحب نے قبل از وقت اپنی دغا اور نباہ کے متعلق میرے دل و دماغ میں شکوک پیدا کر دیئے!

مزید برآں ــ "مجنوں کے خطوط" ــ نے مجھے میری زندگی کے ہر پہلو سے آگاہ کر دیا۔ اور عزیز صاحب نے اپنی بے لوث محبت کو میری بے نیازی کے باوجود ظاہر کیا ثابت کیا۔ اور میری حیات کے ہولناک انجام کو میرے روبرو پیش کر دیا ـــــــ اور ان تمام باتوں کا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ میں نے گناہ کی فضاء سے نکلنے اور اپنے بے لوث غیر ہوس پرست مجنوں کا دامن سنبھالنے کا ارادہ کر لیا۔

چنانچہ ۲۹/ دسمبر ؁۳۰ء کو میں نے اپنے خاموش مجنوں کے دامن میں پناہ لی اور ان سے شرعی عقد کر لیا۔ ان کو اپنا سرتاج بنا لیا۔

۱۵/ جنوری ؁۱۹۳۱ء

۱۴/ جنوری ؁۳۱ء کو ایک شادی کی بڑی دعوت میں شریک ہوئی

اور میں نے مردانے میں کئی ان مشہور ہستیوں کو بانخوت و تمکنت بیٹھے دیکھا۔ جو میرے یہاں شب کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر آیا کرتے تھے اور گھٹنے ٹیکتے تھے۔ ناک رگڑتے تھے۔ اور اپنے ہوس کے دیو کو تسکیں دیتے تھے۔

تعجب ہے کہ جب اُن سے میرا تعارف ہوا تو انھوں نے نگاہ کو اجنبی بنایا اور میری مسکراہٹ کے تاثرات کو بھی مرعوب کرلیا۔ اور ذرا تنکر پیشانی پر بل ڈالا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد آپس میں گفتگو کے وقت میری طرف دیکھکر ناک بھوں بھی چڑھانے لگے ——— مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے عزیز صاحب کے کان میں کہا کہ اگر اجازت ہو تو خبر لیلوں ان بدمعاشوں اور ریاکاروں کی؟ لیکن عزیز صاحب نے جواب دیا کہ نہ ناک بھوں چڑھانا سماج کی مقرر کردہ سزا ہے جس کو تم اپنی حد تک بھگتو اور وہ اپنی حد تک برداشت کریں اور دل میں ڈرتے رہیں ——— اس کے بعد میں باوجود عزیز صاحب کے سمجھانے اور اشارتاً منع کرنے کے زنانخانہ میں چلی گئی ——— اور وہاں نہ پہچاننے والی خاتونوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ لیکن چند ان عورتوں نے جو میری سابقہ زندگی سے کسی نہ کسی ذریعہ سے واقف ہوگئی تھیں سرگوشیوں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نصف سے زیادہ عورتوں کو میری پیشانی کے چھپے ہوئے داغ کو بتلا دیا ——— جس کا اثر یہ ہوا کہ کچھ عورتیں پاس سے اٹھکر چلی گئیں اور چند نے گفتگو سے اجتناب

کیا اور چند شوخ مزاجوں نے میری سابقہ زندگی کے متعلق دلچسپ مگر جان جلانے والے سوالات کرنے شروع کر دیے ——

میں جوابات دیتی رہی اور خجل ہوتی رہی۔ میں نے اُن پر اپنی مجبوریاں ظاہر کیں اپنی مظلومیت بتلائی۔ مگر انھوں نے ہم آواز ہو کہ کہا۔ ایسی زندگی سے تو مر جانا بہتر تھا! میں اس جملہ پر قدرے خجل منفعل اور آبدیدہ ہوگئی۔ جس پر چند خواتین نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "بہن اچھا ہوا کہ تم نے عزیز صاحب سے نکاح کرلیا" اب چند اور نے فرمایا "ہاں خدا بڑا غفور الرحیم ہے توبہ کرتی رہو۔ وہ سب کچھ معاف کر دیگا" —— ایک فرسودہ خاتون نے نصیحت آمیز لہجہ میں کہا —— "دیکھو اب عزیز صاحب کے گھر سے بھاگ نہ جانا۔ ہم نے سنا ہے کہ طوائفیں بہت کم گھروں میں ٹھہرتی ہیں" ایک ہنس مکھ عورت نے جواب دیا۔ "نہیں لیلیٰ کی صورت سے شرافت برستی ہے وہ اب انشاء اللہ شریف ہی رہیں گی" ذرا فاصلے پر ایک تیز مزاج عورت نے دوسری طرف منہ کر کے کہا —— "یہ عزیز صاحب کو کیا ہوا تھا۔ کیا خاندان میں دوسری عورتیں نہ تھیں" وغیرہ وغیرہ میں یہ سب کچھ سنتی رہی اور سہتی رہی۔ میرے دماغ میں ان میں سے بعض کے اُن شوہروں کا خیال آیا جن کو میں بنظر استہزا دیکھ چکی تھی۔ ارادہ کیا کہ ان کو بتلا دوں کہ تمھارے نام نہاد شریف شوہر میرے یہاں چھپ چھپ کر اپنا منہ کالا کرنے آیا کرتے تھے۔ اور پھر پوچھوں کہ ان تمھارے مردوں اور مجھ میں بحیثیت آوارہ انسان

کیا فرق ہے؟ اور ثابت کر دوں کہ وہ مجھ سے زیادہ کمینے بد باطن اور خبیث ہیں —— میں ایک بڑی حد تک مجبور تھی۔ لیکن وہ ہرگز مجبور نہ تھے —— ان کے گناہ میں ارادہ اور لذت اور میرے گناہ میں دونوں چیزیں مفقود یا برائے بہت تھیں —— —— لیکن میں کسی باطنی خوف سے جو غالباً سماج کا دیوتا تھا ڈر گئی اور صبر کر گئی —— میری خاموشی سے ان خبیثوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور پھر مزہ لے کر چھیڑ خوانی شروع کر دی اور طنزیہ فقرے لپیٹ لپیٹ کر سنانے شروع کر دئے۔ میں نے اب بھی چاہا کہ خاموش رہکر اپنی موجودہ شرافت نفسی کا ثبوت دوں۔ لیکن انھوں نے اس کو میری کمزور طبع اور عدم ذکاوت پر محمول کیا۔ جس سے میری خودداری کو ٹھیس لگی اور میں نے شروع کر دیا جو مجھے نہیں چاہئے تھا —— کاش میں صبر کر جاتی!

میں نے کہا۔ ”بہنو! مجھ میں اور تمھارے بعض شوہروں میں محض اتنا فرق ہے کہ ان کی سیاہ کاریاں۔ بد مستیاں اور چھنالی کے داغ پوشیدہ ہیں اور میرے ظاہر! ورنہ وہ مجھ سے زیادہ ذلیل اور قابل حقارت ہیں“ —— میرے ان جملوں نے آگ لگا دی اور وہ بگڑ گئیں اور زوردار طریقہ پر پوچھنے لگیں تبلاؤ ہم میں سے کس کس کے شوہروں کو تم نے اپنے جیسی کمینی کے یہاں دیکھا ہے؟ اس جملہ پر میرے آگ لگ گئی اور میرا خرمن صبر جل گیا۔ میں نے انگلیوں پر۔

وکیل صاحب جاگیردار صاحب نواب صاحب قوم کے لیڈر (رہنما) صاحب۔ ایڈیٹر صاحب۔ سوداگر صاحب مینجر صاحب۔ انسپکٹر صاحب محرر صاحب۔ منشی جی۔ مولوی صاحب۔ شاعر صاحب۔ پہلوان صاحب ممبر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب وغیرہ وغیرہ کے پندرہ بیس نام اور پتے ان کو گنا دیئے۔۔۔ وہ سنتی رہیں اور ــ "ہائے! ہائے!" کہتی رہیں اور تعجب کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہیں ــــ ایک سناٹا چھا گیا۔ اور میرے جذبۂ انتقام کو بہت کچھ سکون ہو گیا۔۔۔ میں چپ ہو گئی۔ خوش ہو گئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف تکنا دیکھنا اور بعض نے خجل ہونا۔ دانت پیسنا اور بھویں تاننا شروع کر دیا۔ میں ان کے جذبات کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی۔ اور خوش ہوتی رہی۔ مگر قلب پر ایک پوشیدہ خوف بھی محسوس کرتی رہی۔ جو معاشرہ کے کارکنان کے استبداد کے خیال کا لرزہ براندام کرنے والا عکس تھا۔ لیکن ظاہراً میں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ آخرش ایک عورت نے کہا۔ "مجھے تو اپنے شوہر کے متعلق یقین نہیں آتا" اتنا سنتے ہی پانچ چھ اور عورتوں نے بھی اسی جملے کو دہرایا۔ اور مجھ سے قسم کھانے کو کہا گیا ــــ میں نے انتہائی سنجیدگی سے قسم کھائی ــــ اب وہ اور حیران ہوئیں ــ حتیٰ کہ شادی کی مجلس کی رنگینیوں کا خیال بھی اُن کے دماغوں سے نکل گیا۔ اور وہ ایک دوسرے کے سامنے اپنی توہین محسوس کرنے لگیں ــــــــ کچھ دیر کے بعد ایک جلی بھنی عورت نے کہا۔ "اُرے بہن! اس کا کیا اعتبار۔ آخر تو

رنڈی ہے"۔ لیکن غالباً ایک ایسی عورت جس کو اپنے شوہر پر اتون
نارات ہونے کی وجہ سے شک ہوا ہو۔" اگر مان بھی لیا جائے کہ لیلیٰ
نے قسم غلط کھائی ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے تمام پتے پیٹے
اور جلیے ان کو صحیح یاد رہیں"۔ اس پر میری جان میں جان آئی ورنہ
میں سراسیمہ ہو گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب ثابت کیسے کروں گی۔

—— اتنے میں ایک آزاد خیال تعلیم یافتہ خاتون آگے بڑھیں
اور اس نے مجھ سے ایک بیحد خوبصورت عورت کا تعارف کرایا اور
کہا۔ "لیلیٰ یہ تمھارے میر صاحب کی دلہن ہیں اور انھوں نے تمھارے
بہت سے واقعات مجھے بتلائے ہیں"۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور
میں نے میر صاحب کی دلہن کو انتہائی استعجاب مگر مسرت بھری نظروں سے
دیکھا۔ میں چاہتی تھی کہ گھنٹوں اس سے باتیں کروں اور میر صاحب کے
متعلق سیکڑوں باتیں پوچھوں لیکن موقع و محل اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔
خاموش ہو گئی۔ اتنے میں میر صاحب کی دلہن اٹھیں اور ایک معمر عورت کو
اپنے ساتھ لائیں اور بتلایا۔ "یہ سردار صاحب کی بیوی ہیں"۔ وہ ایک
بہت نیک اور سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ چپ بیٹھ گئیں اور مجھ سے
کوئی گفتگو نہ کی لیکن میں ان کو اور سردار صاحب کے تصور کو دل کی نگاہوں
سے دیکھتی رہی اور متعجب ہوتی رہی۔ جی نے چاہا کہ ان سے کھل کر بہت سی
باتیں کروں مگر خاموش ہو کر رہ گئی۔ اب اسی آزاد خیال تعلیم یافتہ
عورت نے میری حمایت کی اور اس نے سب کو یقین دلایا کہ جو کچھ میں نے
بیان کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے میں نے دل میں اس خاتون کو دعا دی

میں اور مشکور ہوئی ۔

شام ہوئی اور یہ عورتیں پیچ و تاب کھاتی ہیں میں نے دیکھا کہ انہیں سے چند نے اپنے اپنے شوہروں کی دروازے پر بلا کر خبر لینا شروع کر دی ۔ مگر دبے ہوئے الفاظ میں! خشمناک لہجہ میں ! اس ابتدا سے میں گھبرا گئی اور انجام پر غور کرنے لگی ۔ حتی کہ شب ہوگئی اور میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ تمام مستورات میں کھلبلی مچ گئی ہے کچھ نے میرے وجود کو باعث انتشار اور غیر ضروری سمجھا اور کچھ نے باعث انتباہ اور ضروری سمجھا ۔ الغرض مجھ سے شب کے نو بجے تک اپنے اپنے شوہروں کے شب ناموں کی داستان کے ٹکڑے پوچھے گئے ۔ بعض کا عندیہ میرے بیان کی صداقت کا امتحان تھا اور بعض کا عندیہ اپنے شوہر کے کرتوتوں کو ذرا تفصیل سے معلوم کرنا یاد رکھنا اور وقت ضرورت شوہر کو بتلا کر ثبوت پیش کرنا تھا ۔ اب میرے لیے یہ گھنٹے بے حد دلچسپ ہو گئے اور میں نے بعض باتیں بعض شخص کی بغیر پوچھے ہوئے بھی بتلا دیں اور ایسے لوگوں کے حالات بھی بتلائے جو میرے یہاں تو نہ آتے تھے لیکن ان طوائفوں کے یہاں جاتے تھے جن کو میں بخوبی جانتی تھی دلچسپی اور استعجاب کا دریا بہہ رہا تھا اور میں اس کا منبع و مخرج بنی ہوئی تھی ———— کاش! میں اس گفتگو کو کبھی معاشرہ کے سامنے پیش کر سکتی ! ۔

شب ختم ہوئی۔ صبح ہوئی۔ چھپے ہوئے بدمعاشوں کی بیویوں کے تیور چڑھنے شروع ہو گئے اور انھوں نے لڑائی جھگڑے اور انتقام کے سیکڑوں منصوبے اپنے اپنے دماغوں میں قائم کر لیے۔ اتنے میں عزیز صاحب نے لڑکا بھیجا اور مجھے دروازے پر بلایا۔ جیسے ہی میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ فوراً معلوم کر گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے ـــــ مجھے خجل اور پریشان دیکھ کر عزیز صاحب نے فرمایا۔

"لیلیٰ! جو کچھ تم نے کیا وہ مناسب نہ تھا۔ تمام آدمی جراغ پا ہیں۔ مجھ سے جنگ کر رہے ہیں کہ رہے ہیں تمھاری بیوی نے آفت برپا کر دی۔ آگ لگا دی۔ کتنوں کے گھروں میں لڑائی جھگڑے فتنہ و فساد کے بیج بو دئے۔ ممکن ہے چند عورتوں کو طلاق تک کی نوبت آجائے۔ مہروں کے دعوے ہونے لگیں۔ جدائی علیحدگی اور نان نفقہ کے دعوے ہوں۔ ممکن ہے بعض جہلا کے گھروں میں مارپیٹ تک کی نوبت پہنچ جائے لیلیٰ! تم نے یہ کیا کیا! ـــــــــ میں سہم ضرور گئی لیکن اپنے شوہر کے جذبۂ عفو پر بھروسہ کر کے بولی۔ میرے سرتاج! میں مجبور تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ مجھے معاف فرما دیجئے۔ میری گردن جھک گئی اور عزیز صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اچھی لیلیٰ! میں جانتا ہوں کہ تم کو طعن و تشنیع بھرے جملے سننے پڑے ہوں گے تم کو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا ہوگا ـــــــــ مگر یہ سب تم کو برداشت کرنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ یہ تمھاری سزا تھی اور تم اس کی مستحق تھیں۔ معاشرہ تم کو تمھارے

اعمالوں اور غلطیوں کی سزا ضرور دے گا اور اس میں مجھے بھی شامل کریگا ہر سزا کی طرح اس کی بھی مدت ہوگی اور مدت ختم ہو جانے پر تم کو معاف کر دے گا اور تمہاری مکافات اور تمہاری نیلی اور خوش عملی تم کو پھر آغوش تمدن میں داخل کر دے گی۔ اور تمہارا عزو وقار بھی قائم ہو جائے گا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ سزا کو باآسانی برداشت کرو طعن و تشنیع کو خندہ پیشانی سے سنو اور خاموش رہو۔ ہمت پڑے تو غلطیوں کا اعتراف کرو اور انفعال کا اظہار کرو۔ ایسا کرنے سے سزا کی مدت میں معتدبہ تخفیف ہو جائے گی اور تم بہت جلد سکون حاصل کر سکو گی اور پھر تمہارے سامنے دنیوی اور دینوی دونوں قسم کی راحتیں اور آسائشیں موجود ہو جائیں گی۔ مگر صبر و استقلال اور برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔" میں اس صبر آزما لیکن حوصلہ افزا تلقین کو سنکر خوش ہو گئی اور اپنے فلسفی مجنوں کی طرف اظہار تشکر کے ساتھ دیکھنے لگی۔

بعد ازیں میں عورتوں میں واپس آگئی اور اتنی چپ سادھی کہ عورتوں کو تعجب ہونے لگا۔ اب سلامی کی رسم شروع ہوئی۔ دولھا زنانخانہ میں داخل ہوا اور میں نے جیسے ہی اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ دولھا بھائی بھی میرے نابالغ عاشق رہ چکے تھے۔ میں زیر لب مسکرائی۔ اور باوجود عزیز صاحب کی نصیحتوں کے شرارت سوجھی میں دولھا کے قریب پہنچی اور میں نے ان کے سہرے کو بالکل اوپر کی طرف اٹھا دیا اور آنکھوں میں آنکھیں

ڈالکر کہا۔ "حفیظ صاحب! کہئے مزاج تو اچھا ہے؟" میں جواب کا انتظار کیے بغیر خندہ زن ہوئی اور دولہا ایکدم چونکا۔ گھبرا گیا اور شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ بغلیں جھانکنے لگا۔ تھا ہوشیار! اس نے سہرا منہ پر ڈال لیا اور اپنی خفت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ میں جیسے ہی جذبۂ شرارت کی محکومیت سے آزاد ہوئی موقع و محل کی نزاکت کا احساس کرنے لگی۔ ادھر دولہا کی حالت قابل رحم تھی۔ مجھ کو اس پر رحم آ ہی گیا اور میں وہاں سے ہٹ گئی۔ لیکن عورتیں مشکوک ہو چکی تھیں دولہن کی والدہ سے کانا پھوسی شروع ہوئی اور دولہا کو سلامی دے دلا کر جلد باہر بھیجدیا گیا لیکن لڑکی بھیجنے سے انکار کر دیا گیا۔

اب میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ سرتاپا کانپ اٹھی۔ اور اپنی حرکت پر افسوس کرنے لگی سوچتے سوچتے ایک اچھے نتیجے پر پہنچی اور دولہن کی والدہ کے پاس گئی اور اس کو جھوٹ بول کر سمجھایا کہ مجھے مغالطہ ہوا تھا۔ دولہا کی صورت ایک ایسے شخص سے ملتی جلتی تھی جو میرے یہاں آتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

الغرض خدا خدا کر کے لڑکی رخصت ہوئی اور پھر سب عورتیں بھی رخصت ہونے لگیں۔ اور میں بھی موٹر میں بھیگی بلّی کی طرح عزیز صاحب کے برابر خاموش بیٹھی ہوئی اپنے مکان پہنچ گئی۔ اور گذشتہ واقعات پر غور کرنے لگی۔ عزیز صاحب برافروختہ ہو گئے اور بغیر کچھ کہے سنے باہر تشریف لیگئے ــــ دیکھیے کیا ہوتا ہے! کتنے میاں بیویوں میں جھگڑے ہوتے ہیں، کتنے گھر بگڑتے ہیں ــــ اور مجھے بھی مکان میں رکھا جاتا ہے ــــ یا ــــ عزیز صاحب معاشرہ (سماج)

کے آگے ہتھیار ڈال کر مجھ کو بھی مکان سے باہر نکال لیتے ہیں! بہرنوع کچھ بھی ہو۔ میری روح کو ایک قسم کا وجدانی اطمینان ضرور حاصل ہے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بُرا نہ تھا۔ حقیقت تھی! صداقت تھی!۔۔ معاشرہ کے ڈھول پر چوٹ تھی ضرب کاری تھی۔

کاش چند ضربیں اور لگاؤں اور اس ڈھول کو پھوڑ ڈالوں۔ معاشرہ کے ارباب حل و عقد کو صلح کے لیے مجبور کروں پھر ہلکے پھلکے سازو سامان سے ساز بناؤں اور زن و مرد کی مساوات کے ترانے گاؤں۔ حقیقی راحت اور سرشاری کے بربط و چنگ بجاؤں اور فضائے عالم پر چھا جاؤں۔ پرند و چرند کو بھی ہم صفیر و ہم نوا کر لوں اور اب ہمارے نغموں سے دنیا گونج اٹھے۔ اور ہر طرف روح پرور ہوائیں چلنے لگیں۔ ڈالیاں جھومنے لگیں۔ غنچے کھلنے لگیں۔ پھول برسنے لگیں۔ زمین پاک و صاف ہو جائے۔ زرخیز ہو جائے اور دنیا میں اچھے ہی اچھے بیج بوئے جانے لگیں!

مطبوعات عبدالحق اکیڈیمی

سادہ و رنگین افسانے محض چند معیاری افسانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ادب اردو کے جمود اور رجعت پسندی کے خلاف ایک کوشش بلیغ ہے۔ اس کے مصنف ظفر قریشی ہیں۔ جن کے جدت پسند دماغ کا یہ مرقع ہے۔ قیمت عہ۔

لہو ترنگ دکن کے ہونہار اور مایہ ناز شاعر سکندر علی وجد بی۔ اے (آنرز) ایچ۔ سی۔ ایس کا مجموعہ کلام آپ کی فکر و نظر کیلئے ایک دعوت عمل ہے۔ وجد لفظی شاعری کے قائل نہیں۔ ان کے نغمات کے شعلوں میں خواب زندگی کی حقیقی تعبیریں ہیں۔ قسم اول ۲ روپے، قسم دوم ۳ روپے۔

مرمر اور خون عزیز احمد کا مشہور نفسیاتی ناول جس میں بتایا گیا ہے کہ جذبات پرست امیرزادوں کے لئے مفلسی ایک کھلونا ہے۔

کارخانہ ظریف فطرت فضل الرحمن کا مزاحیہ ڈرامہ سرمایہ داری، مزدور اور مزدور کی لیڈری پر عجیب انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ قیمت ۱۲

کلیات حسرت حسرت کے دل سے نکلے ہوئے وہ دلفریب نغمات جنھیں سن کر حسن و عشق دونوں جھوم جاتے ہیں...... قیمت ہے

جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی موجودہ جنگ دنیا کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے۔ مگر اس لعنت کو دنیا پر مسلط کرنے والے

کون ہیں۔ انہوں نے کن خود غرضانہ مقاصد کے پیش نظر اس انسانی دشمنی کا ثبوت دیا...... قیمت [illegible]

انتقادیات، (اول و دوم) تنقیدی مضامین' نیاز فتحپوری قیمت [illegible]

مضامین فرحت (دوم) مرزا فرحت اللہ بیگ کے مزاحیہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ قیمت [illegible]

پرانے خدا کرشن چندر کے ان نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں زندگی کی حقیقی جھلک نمایاں ہے۔

مسکراتے آنسو بھارت چند کھنہ۔ یہ ایک آئینہ ہے جو آپ کو اپنے اصلی خدوخال سے روشناس کرائے گا۔ ہماری زندگی عیش و غم شادی و ماتم سے عبارت ہے۔

لینن گراڈ تا سمرقند عشرت علی صدیقی' چند گھنٹے مزدور کی دنیا میں بسر کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ مزدور نے اپنے لئے جو دنیا کی تعمیر کی ہے۔ وہ ہماری دنیا سے کسی حد تک بہتر ہے۔ یہ دلچسپ سفرنامہ آپ کو ایک انوکھی سرزمین کی سیر کرائے گا۔

نئے پرانے (سہیل عظیم آبادی) وہ افسانہ افسانہ نہیں جو ناظرین کو متاثر نہ کر دے اور وہ دل' دل نہیں جو سہیل کے ان افسانوں سے تڑپ نہ اٹھے۔

مضامین فرحت (ہفتم) مرزا فرحت اللہ بیگ کے نئے مضامین کا مجموعہ ہے۔

پاک بیبیاں رضؓ۔ اعجاز الحق قدوسی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کی زندگی کے حالات۔

آسان تاریخ اسلام بچوں کے لئے آسان اور عام فہم زبان میں اسلامی تاریخ کو بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر حلیمہ خانم ابوالقلم حسن الدین خاموش کا تبلیغی ناول ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان خاتون نے کس طرح

اریہ سماجیوں کی شاطرانہ چال سے چھٹکارا حاصل کیا۔

بچوں کے خطوط، مولوی عبدالحق۔ خط و کتابت پر سب سے اچھی کتاب

افسانچے، علامہ دتاتری کیفی کے۔ افسانوں کے ساز میں رواداری کے مشرقی تہذیب کی علمبرداری، پریم، محبت کے وہ دلربا نغمے پنہاں ہیں جو ان کے دل و دماغ کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

نوک جھونک، لڑائی ایک دلچسپ گھریلو مشغلہ اور تفریح ہے۔ اگر آپ اس خیال کے منکر ہوں تو کوثر چاندپوری کی اس دلچسپ تصنیف کو پڑھ کر دیکھئے۔

نقش امروز، دکن کے فاضل ادیب ممتاز ترقی پسند شاعر علی اشرف کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔

یوگ آسن، مصنفہ مرزا عصمت اللہ بیگ، خوش خرم زندگی تندرستی پر منحصر ہے۔ اور تندرستی کا انحصار ورزش پر ہے۔

نواب صاحب کی ڈائری۔ نو مزاحیہ مضامین کا مجموعہ مرزا فرحت اللہ بیگ ہے

روزنامچہ، زبان اردو کے سب سے زیادہ مفکر قاضی عبدالغفار کے قلم سے یہ تصنیف زمانہ حال کے ایک تعلیم یافتہ گمکردہ راہ جوان کی ذہنی کیفیات کا آئینہ ہے۔ جس کے نظریات زندگی ہر صاحب فکر و نظر کے لئے ایک دعوت بصیرت ہیں۔ اس قابل قدر تصنیف سے استفادہ نہ کرنا ایک عظیم علمی نقصان ہے۔

چلمن گزٹ، ۱۹۴۶ء کی سب سے زیادہ کامیاب مزاحیہ تصنیف ہے اگر آپ زندگی کی سنجیدگیوں سے اکتا چکے ہوں تو اس کا مطالعہ ضرور کیجئے۔ موجودہ سماج کے چند اہم ترین پہلوؤں کا ایک کامیاب ترین مزاحیہ خاکہ، ناز شاکر۔

نئی بیماری، ادب جدید کے ان گراں مایہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو موجودہ نئے سماج کی نئی بیماریوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اور ان کا علاج بھی

بھی تجویز کرتے ہیں۔ از مہندر ناتھ۔

انور، اردو کے مایہ ناز ناول نگار **منشی فیاض علی** کا وہ اچھوتا ناول جو اردو ادب کی جان ہے۔ عرصہ دراز سے کم یاب تھا زیور طبع سے آراستہ کرکے شائقین ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب مجلد عہ

کلیاتِ فانی۔ فانی کی حیات شاعری کا حاصل جس میں تمام غیر مطبوعہ غزلیں بھی شامل ہیں۔ صحت زبان معاملات قہر و محبت کی صحیح ترجمانی جذبات دل کی حقیقی عکاسی۔ کیف و اثر ان تمام خصوصیات کے اعتبار سے فانی کا کلام اپنی آپ نظیر ہے۔ اس کی حقیقی عظمت اس حزن و یاس میں پنہاں ہے۔ جو اسکی شعریت کا سب سے نمایاں عنصر ہے۔ اور یہی وہ مقام جہاں وہ دوسرے تمام شعرا سے علیحدہ ممتاز نظر آتا ہے۔ للعہ

شمیم مصنفہ۔ **منشی فیاض علی**، ہندوستان کا وہ مشہور ناول نگار جس کے زور قلم نے یہ ناول لکھ کر اردو ناول نگاری میں ایک نئی روح پھونک دی یہ ناول فن ناول نویسی کی جملہ خصوصیات سے پُر ہے۔ اس میں واقفیت خلوص اور منطقی تسلسل شروع سے آخر تک ہے۔ یہ ناول افراد کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کرتا ہے۔ موضوع اور پلاٹ بہت خاص ہے۔ جو ماحول و مواقع کی نسبت سے بڑھتا جاتا ہے۔ کردار نگاری بہت بلند ہے۔ شائع کیا ہے۔ لعہ

مسکراہٹیں، بھارت چند کھنہ، کے طنزیہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ بھارت چند کھنہ کی چٹکیاں، قہقہوں میں، آنسو مسکراہٹ میں نالہائے شرربار گلہائے خندہ میں اور جوالا مکھی سیل تبسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مطالعہ سے

معلوم ہوگا کہ مصیبتیں نہیں بلکہ ایک امتحان ہے۔ ۱۴/

مسک! محشر عابدی۔ کے حشر ساماں اور محشر بداماں افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے ہر افسانہ میں تخیل کی رومانیت اور طرز نگارش کی موسیقیت اپنے منتہائے عروج پر نمایاں ہے۔ کہیں شباب کی بجھتیاں ہیں کہیں جوانی کی بیقراریاں۔ کسی مقام پر عشق کروٹیں بدل رہا ہے تو کسی جگہ حسن خود بیتاب تماشہ دکھائی دیتا ہے۔ ۱۸/

یاد ایام: عبدالرزاق کانپوری ... ... لے

لال چندری: اسمٰعیل احمد تسنیم مینائی ۱۸/

لیلیٰ کی ڈائری: عطاء الرحمٰن خاں ... ... ے

کلیم: قیسی رامپوری ... ... ے

مغنیہ: عشرت بخاری ۱۴/

خانقاہ: ایم اسلم ... ... ے

لغزشیں: عابدی جعفر ۱۲/

طبع شدہ بچوں کی کتابیں

پھر پھر	۸ر
اندھیر نگری	۴ر/۶ر
بالوں والا درخت	۸ر
چالاک مرغا	۱۲ر
ہونہار شہزادہ	۱۲ر
غرور کا انجام	۱۲ر
لڑکے کا خواب	۱۲ر
ایک روپیہ کی کہانی	۵ر
ہمارا ہندوستان	۳ر
دابن سن کردسو	۱۰ر
چھومنتر کا دھاگا	۴ر
لاڈلا اکبر	۱۰ر
سمندری جہاز	۴ر
بغداد کا خلیفہ	۱۰ر
چھتری فوج	۳ر
دسترخوان	۳ر
سادہ زندگی	۳ر
چوہیا بیگم	۶ر
کپڑے	۳ر
پڑوس	۳ر
جنگ کے بعد کیا ہوگا۔	۳ر
گاؤں کا مکھیا	۶ر
سمندر کا شہزادہ	۱۲ر
وفادار دوست	۱۲ر
دغاباز دوست	۱۲ر
عدل شیر شاہی	۱۲ر
کالا دیو	۳ر
بولتی کیتلی	۳ر
قم قم قما قیل	۵ر
شیی تارو	۳ر/۶ر
یوراشیما	۲ر/۶ر
چھنگی خاں	۵ر
مقدس چرخہ	۸ر
بچوں کے خطوط (اول دوم)	عہ

رسالہ ہماری کتابیں ماہنامہ

یہ اردو میں اپنے طرز کا واحد علمی تحقیقی اور تنقیدی رسالہ ہے جو علی شبر صاحب حاتمی بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) کے زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ میں ہر ماہ عنوانات ذیل کے تحت بہترین مضامین شائع ہوتے ہیں۔

مقالات: مشاہیر مفکرین اردو اور بلند پایہ محققین ادب کے افکار جمیل اور تحقیقات انیق کے بیش بہا جواہر پارے۔

اچھے مضامین: ہندوستان کے مشہور رسائل کے منتخبہ مضامین کا تعارف افادیت کے لحاظ سے قابل مطالعہ کتاب۔ کتاب کا مختصر اور جامع خلاصہ۔

تذکرہ: محسنین اردو اور مشاہیر ادب کے ذاتی حالات زندگی اور علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی روشنی میں مبسوط جائزہ۔

علمی استفسارات: قارئین کے تحقیق طلب استفسارات کے معلومات افزا اور بصیرت افروز جوابات نہایت دلکش رنگین اور پسندیدہ طرز بیان میں۔

تبصرہ: فن تنقید کے جدید اصولوں کے ساتھ زبان، روز مرہ، محاورہ، بندش، ترتیب، تقسیم، نیز مواد پر ماہرانہ انتقاد۔

تعارف: جدید ترین مطبوعات اردو کی فن وار تقسیم اور عنوان موضوع کا سرسری تذکرہ۔

علم کتب خانہ: کتب خانوں اور دارالمطالعوں سے متعلق ٹھوس اور فنی مضامین۔

تکملہ: ایک سو سے زائد مطبوعات کے نام مع مصنف، ناشر، قیمت، سنہ اشاعت اور فنی تقسیم۔

سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی اور گورنمنٹ سندھ نے مدارس کیلئے منتخب منظور فرمایا ہے۔

چندہ سالانہ عہ

مہتمم محمد عبدالہادی (عثمانیہ)
اردو منزل۔ اردو گلی۔ حیدرآباد دکن

فی پرچہ ۸؍